# چچا چھکن

از

سیّد امتیاز علی تاج

سنہ ۱۹۴۱ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

بار دوم ۱۰۰۰ قیمت عمر

# دیباچہ

انگریز مصنف جیروم۔ کے جیروم۔ کی ایک کتاب "تھری من ان اے بوٹ" ہے۔ اس کتاب میں ایک مقام پر "انکل پوجر" کے تصویر ٹانگنے کا تذکرہ ظریفانہ انداز میں ہے۔ ۲۶ء میں مدیر نیرنگ خیال نے مجھ سے فرمائش کی۔ کہ میں ان کے عید نمبر کے لئے اس مضمون کا ترجمہ اردو میں کر دوں۔ مجھے جیروم کی ظرافت کا لطف ترجمے میں برقرار رکھنا ناممکن معلوم ہوا۔ چنانچہ میں نے بجائے ترجمہ کرنے کے انگریزی مضمون سامنے رکھ کر اسے از سر نو اردو میں لکھ دیا۔ اور "انکل پوجر" کو اردو میں چچا چھکن کے نام سے موسوم کیا۔

## دیباچہ

ان دنوں اردو کے مصنف ظریفانہ انداز میں کردار نگاری نہ کر رہے تھے۔ چنانچہ جو لوگ انگریزی نہیں جانتے۔ انہیں یہ مضمون نیا اور دل چسپ معلوم ہُوا۔ اور انہوں نے مجھ سے اسی قسم کے اَور مضامین لکھنے کی فرمائش کی۔ مذکورہ بالا کتاب میں ایک دوسرے مضمون کے لئے بہت تھوڑا سا مواد موجود تھا اس میں بیشتر باتیں خود شامل کر کے میں نے دوسرا مضمون "چچا چھکن تو چندی دیکھنے چلے" لکھ دیا۔

یہ مضمون پہلے مضمون سے بھی زیادہ پسند کیا گیا۔ کئی رسالوں کے اڈیٹروں نے مجھ سے فرمائش کی۔ کہ میں ان کے خاص نمبروں کے لئے چچا چھکن کا کوئی اَور کارنامہ لکھ دوں۔ بعض رسائل و جرائد نے اس موضوع کو اپنی رونق افروزی کے لئے اس درجہ اہم سمجھا۔ کہ دوسرے لکھنے والوں سے چچا چھکن کے کارنامے لکھوا کر اپنے ہاں شائع کرنے شروع کر دئے۔

میں شاید اس موضوع پر زیادہ مضامین نہ لکھتا۔ لیکن میرے بزرگ اور نامور دوست شفا الملک حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی (مرحوم) کا اصرار اکثر موقعوں پر مجھ سے اسی موضوع پر قلم اٹھواتا

## دیباچہ

رہا۔ فی الحقیقت ان ہی کی حوصلہ افزائی اس امر کی ذمہ وار ہے کہ ان مضامین کی ضخامت نے ایک مختصر سی کتاب کا حجم اختیار کر لیا۔

اس کتاب میں صرف چچا چھکن کی اندرونِ خانہ زندگی کے بعض پہلوؤں کا تذکرہ ہے۔ اگر اس موضوع سے میں اُوبْ نہ زیادہ نہ اکتا گیا۔ تو شاید کبھی ان کی بیرون خانہ سرگرمیوں پر بھی قلم اٹھاؤں۔

یہ مضامین بے حد ناچیز ہیں۔ صرف اس خیال سے انہیں کتابی صورت میں شائع کر رہا ہوں۔ کہ جو لوگ انہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ انہیں رسائل کے پرانے نمبر دستیاب نہیں ہو سکتے۔ مضامین کے یکجا ہو جانے سے انہیں سہولت ہو گی۔ مگر میری رائے میں ان مضامین کی اشاعت سے اردو کو اتنا فائدہ ضرور پہنچا۔ کہ انہوں نے مجھ سے بہتر ظرافت نگاروں کو کردار نگاری کی طرف متوجہ کر دیا۔

سید امتیاز علی تاج

# فہرست مضامین

# چچا چھکن نے تصویر ٹانگی

چچا چھکن کبھی کبھار کوئی کام اپنے ذمے کیا لے لیتے ہیں گھر بھر کو تگنی کا ناچ نچا دیتے ہیں۔ آ بے لونڈے۔ جا بے لونڈے۔ یہ کیجو۔ وہ دیجو۔ گھر بازار ایک ہو جاتا ہے۔ دور کیوں جاؤ۔ پرسوں پرلے روز کا ذکر ہے۔ دکان سے تصویر کا چوکھٹا لگ کر آیا۔ اُس وقت تو دیوان خانے میں رکھ دی گئی۔ کل شام کہیں چچی کی نظر اُس پر پڑی۔ بولیں "چھٹن کے ابا تصویر کب سے رکھی ہوئی ہے۔ خیر سے بچوں کا گھر ٹھیرا۔ کہیں ٹوٹ پھوٹ گئی۔ تو بیٹھے بٹھائے روپے دو روپے کا دھکا لگ جائے گا۔ کون ٹانگے گا اس کو؟"

"ٹانگتا اور کون ۔ میں خود ٹانگوں گا ۔ کون سی ایسی جوئے شیر لانی ہے ۔ رہنے دو ۔ میں ابھی سب کچھ خود ہی کئے لیتا ہوں"۔

کہنے کے ساتھ ہی شیروانی اُتار چچا تصویر ٹانگنے کے درپے ہو گئے ۔ امامی سے کہا "بیوی سے دو آنے پیسے لے کر میخیں لے آ" ۔ اِدھر وہ دروازے سے نکلا اُدھر مودے سے کہا "مودے مودے! جانا امامی کے پیچھے ۔ کہیو تین تین انچ کی ہوں میخیں ۔ بھاگ کر جا ۔ جا لیجو اُسے راستے ہی میں" ۔ لیجئے تصویر ٹانگنے کی داغ بیل پڑ گئی ۔ اور اب آئی گھر بھر کی شامت ۔

ننھے کو پکارا "او ننھے جانا ذرا میرا ہتھوڑا لے آنا ۔ بنو! جاؤ اپنے بستے میں سے چیتی نکال لاؤ ۔ اور سیڑھی کی ضرورت بھی تو ہوگی ہم کو ۔ ارے بھئی للّو! ذرا تم جا کر کسی سے کہہ دیتے ۔ سیڑھی یہاں لا کر لگا دے ۔ اور ہاں دیکھنا ۔ وہ لکڑی کے تختے والی کرسی بھی لیتے آتے تو خوب ہوتا ۔ چھٹن بیٹے! چائے پی لی تم نے؟ ذرا جانا تو اپنے ان ہمسائے

میر باقر علی کے گھر۔ کہنا ابّا نے سلام کہا ہے۔ اور پوچھا ہے آپ کی ٹانگ اب کیسی ہے۔ اور یہ کہیو۔ وہ جو ہے نا آپ کے پاس۔ کیا نام ہے اُس کا۔ اسے لو بھول گیا۔ پلول تھا کہ ملول۔ اللہ جانے کیا تھا۔ خیر وہ کچھ ہی تھا۔ تو یوں کہہ دیجو۔ کہ وہ جو آپ کے پاس آلہ ہے نا۔ جس سے سیدھ معلوم ہوتی ہے۔ وہ ذرا دے دیجئے تصویر ٹانگنی ہے۔ جا بیو میرے بیٹے۔ پر دیکھنا سلام ضرور کرنا اور ٹانگ کا پوچھنا نہ بھول جانا۔ اچھا؟" . . یہ تم کہاں چل دئے للّو؟ کہا جو ہے ذرا یہیں ٹھیرے رہو۔ سیڑھی پر روشنی کون دکھائے گا ہم کو؟ آ گیا امامی؟ لے آیا میخیں؟ مو دامل گیا تھا؟ تین تین انچ ہی کی ہیں نا؟ بس بہت ٹھیک ہیں۔ اسے لو سُتلی منگوانے کا تو خیال ہی نہ رہا۔ اب کیا کروں؟ جانا میرا بھائی جلدی سے۔ ہوا کی طرح جا۔ اور دیکھیو بس گز سوا گز ہو سُتلی۔ نہ بہت موٹی ہو نہ پتلی۔ کہہ دینا تصویر ٹانگنے کو چاہئے ہے۔ لے آیا؟ اور دوّو! دوّو کہاں گیا؟ دوّو میاں! اسی وقت سب کو اپنے اپنے کام کی سوجھی ہے۔

یوں نہیں کہ آ کر ذرا ہاتھ بٹائیں۔ یہاں آؤ۔ تم کرسی پر چڑھ کر مجھے تصویر پکڑانا۔"

لیجئے صاحب خدا خدا کر کے تصویر اُٹھانے کا وقت آیا مگر ہونی شدنی۔ چچا اسے اُٹھا کر ذرا وزن کر رہے تھے۔ کہ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ گر کر شیشہ چُور چُور ہو گیا" ہئی ہے!" کہہ کر سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ چچا نے کچھ خفیف ہو کر کرچوں کا معائنہ شروع کر دیا۔ وقت کی بات انگلی میں شیشہ چبھ گیا۔ خون کی تللی بندھ گئی۔ تصویر کو بھول اپنا رومال تلاش کرنے لگے۔ رومال کہاں سے ملے؟ رومال تھا شیروانی کی جیب میں۔ شیروانی اُتار کر نہ جانے کہاں رکھی تھی۔ اب جناب گھر بھر نے تصویر ٹانگنے کا سامان تو طاق پر رکھا اور شیروانی کی ڈھونڈیا پڑ گئی۔ چچا میاں کمرے میں ناچتے پھر رہے ہیں کبھی اس سے ٹکر کھاتے ہیں۔ کبھی اُس سے۔" سارے گھر میں سے کسی کو اتنی توفیق نہیں۔ کہ میری شیروانی ڈھونڈ نکالے۔ عمر بھر ایسے نکموں سے پالا نہ پڑا تھا۔ اور

کیا جھوٹ کہتا ہوں کچھ؟ چھ چھ آدمی ہیں۔ اور ایک شیروانی نہیں ڈھونڈھ سکتے۔ جو ابھی پانچ منٹ بھی تو نہیں ہوئے میں نے اُتار کر رکھی ہے۔ بھئی بڑے ۔۔۔"

اتنے میں آپ کسی جگہ سے بیٹھے بیٹھے اُٹھتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں۔ کہ شیروانی پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں "ارے بھئی رہنے دینا۔ مل گئی شیروانی ڈھونڈلی ہم نے۔ تم کو تو آنکھوں کے سامنے بیل بھی کھڑا ہو تو نظر نہیں آتا"۔

آدھے گھنٹے تک انگلی بندھتی بندھاتی رہی۔ نیا شیشہ منگوا کر چوکھٹے میں جڑا۔ اور تمام قصے طے کرنے پر دو گھنٹے بعد پھر تصویر ٹانگنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔ اوزار آئے۔ سیڑھی آئی۔ چوکی آئی۔ شمع لائی گئی۔ چچا جان سیڑھی پر چڑھ رہے ہیں۔ اور گھر بھر (جس میں ماما اور کہاری بھی شامل ہیں) نیم دائرے کی صورت میں امداد دینے کو کیل کانٹے سے لیس کھڑا ہے۔ دو آدمیوں نے سیڑھی پکڑی۔ تو چچا جان نے اس پر قدم رکھا۔ اوپر پہنچے۔ ایک نے کرسی پر چڑھ کر میخیں

بڑھائیں۔ ایک قبول کرلی۔ دوسرے نے ہتھوڑا اوپر پہنچایا سنبھالا ہی تھا۔ کہ میخ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ کھسیانی آواز میں بولے "اے لو۔ اب کمبخت میخ چھوٹ کر گر پڑی! دیکھنا کہاں گئی؟"

اب جناب سب کے سب گھٹنوں کے بل ٹٹول ٹٹول کر میخ تلاش کر رہے ہیں۔ اور چچا میاں سیڑھی پر کھڑے مسلسل بڑبڑا رہے ہیں۔ "ملی؟ ارے کمبختو ڈھونڈی؟ اب تک تو میں سو مرتبہ تلاش کر لیتا۔ اب میں رات بھر سیڑھی پر کھڑا کھڑا سوکھا کروں گا۔ نہیں ملتی تو دوسری ہی دے دو اندھو!"

یہ سنکر سب کی جان میں جان آتی ہے۔ تو پہلی میخ ہی مل جاتی ہے۔ اب میخ چچا جان کے ہاتھ میں پہنچاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔ اس عرصے میں ہتھوڑا غائب ہو چکا ہے۔

"یہ ہتھوڑا کہاں چلا گیا؟ کہاں رکھا تھا میں نے؟ لاحول ولا قوۃ! اُلو کی طرح آنکھیں پھاڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ سات آدمی اور کسی کو معلوم نہیں ہتھوڑا

میں نے کہاں رکھ دیا؟"

بڑی مصیبتوں سے ہتھوڑے کا سراغ نکالا۔ اور میخ گاڑنے کی نوبت آئی۔ اب آپ یہ بھول بیٹھے ہیں۔ کہ ماپ کے بعد میخ گاڑنے کو دیوار پر نشان کس جگہ کیا تھا۔ سب باری باری کرسی پر چڑھ کر کوشش کر رہے ہیں۔ کہ شاید نشان نظر آ جائے۔ ہر ایک کو الگ الگ جگہ نشان دکھائی دیتا ہے۔ چچا سب کو باری باری اُلّو گدھا کہہ کہہ کر کرسی سے اتر جانے کا حکم دے رہے ہیں۔ آخر پھر چھپتی لی اور کونے سے تصویر ٹانگنے کی جگہ کو دوبارہ ماپنا شروع کیا۔ مقابل کی تصویر کونے سے پینتیس انچ کے فاصلے پر لگی ہوئی تھی۔" بارہ اور بارہ اور سکے انچ اور؟"

بچوں کو زبانی حساب کا سوال ملا۔ باواز بلند حل کرنا شروع کیا۔ اور جواب نکالا۔ تو کسی کا کچھ تھا اور کسی کا کچھ۔ ایک نے دوسرے کو غلط بتایا۔ اسی تو تو میں میں میں سب بھول بیٹھے کہ اصل سوال کیا تھا۔ نئے سرے

سے ماپ لینے کی ضرورت پڑ گئی ۔

اب کے چچا چھتی سے نہیں ماپتے۔ سُتلی سے ماپنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سیڑھی پر پینتالیس درجے کا زاویہ بنا کر سُتلی کا سرا کونے تک پہنچانے کی کوشش میں ہیں۔ کہ سُتلی ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے ۔ آپ لپک کر اسے پکڑنا چاہتے ہیں۔ کہ اسی کوشش میں زمین پر آ رہتے ہیں۔ کونے میں ستار رکھا تھا۔ اس کے تمام تار چچا جان کے بوجھ سے یکلخت جھنجھنا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں ۔

اب چچا کی زبان سے جو منجھے ہوئے الفاظ نکلتے ہیں سننے کے قابل ہوتے ہیں۔ مگر چچی روک دیتی ہیں ۔ اور کہتی ہیں " اپنی عمر کا نہیں۔ تو ان بچوں ہی کا خیال کرو"۔

بہت دشواری کے بعد چچا جان از سرِ نو میخ گاڑنے جگہ معین کرتے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے اس جگہ میخ رکھتے ہیں اور دائیں ہاتھ سے ہتھوڑا سنبھالتے ہیں۔ پہلی ہی چوٹ جو پڑتی ہے۔ تو سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے پر۔ آپ "سی" کر کے ہتھوڑا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ نیچے آ کر گرتا ہے

کسی کے پاؤں پر۔ ہائے ہائے اور اُفوہ اور مار ڈالا شروع ہو جاتی ہے ❖

چچی جل بھن کر کہتی ہیں "یوں میخ گاڑنا ہوا کرے۔ تو مجھے آٹھ روز پہلے خبر دے دیا کیجئے۔ میں بچوں کو لے کر میکے چلی جایا کروں۔ اور نہیں تو" ❖

چچا نادم ہو کر جواب دیتے ہیں۔ "یہ عورت ذات بھی بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہے یعنی ہوا کیا۔ جس پر یہ طعنے دئے جا رہے ہیں؟ بھلا صاحب کان ہوئے۔ آئندہ ہم کسی کام میں دخل نہ دیا کریں گے" ❖

اب نئے سرے سے کوشش شروع ہوئی۔ میخ پر دوسری چوٹ جو پڑی۔ تو اس جگہ پلستر نرم تھا۔ پوری کی پوری میخ اور آدھا ہتھوڑا دیوار میں اور چچا اچانک میخ گڑ جانے سے اس زور سے دیوار سے ٹکرائے۔ کہ ناک غیرت والی ہوتی تو پچک کر ہی رہ جاتی ❖

اس کے بعد از سر نو چفتی اور رسی تلاش کی گئی۔ اور میخ گاڑنے کی نئی جگہ مقرر ہوئی۔ اور کوئی آدھی رات کا

عمل ہوگا۔ کہ خدا خدا کرکے تصویر ٹنگی۔ وہ بھی کیسی؟ ٹیڑھی بینگی اور اتنی جھکی ہوئی کہ جیسے اب سر پر آئی۔ کہ اب سر پر آئی۔ چاروں طرف گز گز بھر دیوار کی یہ حالت گویا چاندماری ہوتی رہی ہے۔ چچا کے سوا باقی سب تھکن سے چور چور نیند میں جھوم رہے ہیں۔ اب آپ آخری سیڑھی پر سے دھم سے جو اترتے ہیں۔ تو کہاری غریب کے پاؤں پر پاؤں غریب کے ڈیل تھی۔ تڑپ ہی تو اٹھی۔ چچا اس کی چیخ سنکر ذرا سراسیمہ تو ہوئے۔ مگر پل بھر میں داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے اتنی سی بات تھی اگ بھی گئی۔ لوگ اس کام کے لئے مستری بلوایا کرتے ہیں"۔

# چچا چھکّن نوچندی دیکھنے چلے

خدا نہ کرے۔ جو چچا چھکّن کو کہیں کا سفر درپیش ہو۔ وہ آفت مچاتے اور ڈھونگ دھتیّا کرتے ہیں۔ کہ خدا کی پناہ! بڑے شکر کا مقام تو یہ ہے۔ کہ خود سفر سے کتراتے ہیں۔ چھُنّو آپا کی شادی ہوئی۔ چچی بے چاری جانا جانا کرتی رہ گئیں۔ پر چچا نے لکھ بھیجا۔ "ننّھی کو گئے دنوں پسلی ہو گئی تھی۔ حکیم جی ابھی سفر کی اجازت نہیں دیتے۔" بنّو آپا کے ہاں پہلونٹھی کا لڑکا ہوا۔ چچی غریب نے بچے کے لئے کچھ نہیں۔ تو درجن بھر جوڑے تیار کئے ہوں گے۔ خود لے کر جانا چاہتی تھیں۔ پر چچا نے عین وقت پر ارادہ فسخ کر دیا

پارسل کے ساتھ خط میں لکھ بھیجا" چھٹن کی باری ابھی نہیں ٹلی۔ مجبور ہوں کہ نہیں آسکتا"۔

چچی غریب کا کہنا تو بآسانی ٹل جاتا ہے۔ پر جہاں کہیں یاروں دوستوں نے کسی میلے یا عُرس پر جانے کی تیاریاں کیں۔ چچا سے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ ذرا وہاں کی رونق اور گہما گہمی بیان کر دی۔ ساتھ ہی طعنہ دیا۔ "اماں جا چکے تم۔ گھر سے اجازت ہی نہیں ملنے کی۔" دانت دین کی بیگم صاحبہ" بس تڑپ اٹھے چچا" واہ! وہ نیک بخت تو خود مجھ سے کہتی رہتی ہے کہ کبھی گھر سے نکلا بھی کرو۔ اور اگر نہ بھی کہتی ہو۔ تو میں کسی کا بندھا غلام ہوں۔ کہ جی چاہے اور نہ جاؤں۔ بھئی تمہیں ہماری ہی قسم جواب جانے کا ارادہ ملتوی کرو"۔

یہ صورت حالات ہو تو اللہ ہی نے کہا ہے کہ اس قسم کے ہر سفر پر چچا اور چچی میں کھٹ پٹ ہو جائے۔

ابھی پچھلی ہی نوچندی پر مُنّے مرزا اور نوشاہ میاں نے میرٹھ چلنے کی ٹھانی۔ چچا سے ٹھیری ان کی دانت

کاٹی روٹی۔ دو چار فقرے جو کسے تو چچا چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ شام کو روانگی کا ارادہ تھا۔ صبح ناشتے کے وقت باتوں باتوں میں چچی اماں سے اس کا ذکر کیا۔

"وہ منّے اور نوشاہ جا رہے تھے نوچندی میں۔ کہو تو ہم بھی ہو آئیں؟"

چچی اماں بھڑک اٹھیں "اللہ سمجھے اس منّے اور نوشاہ سے۔ خدائی خوار کہیں کے۔ کبھی کوئی نیک راہ نہ دکھائی۔ مَیں کہتی ہوں۔ یہ تو تمہاری عمر۔ بال کھچڑی ہو گئے۔ خیر سے کئی کئی بچوں کے باپ بن چکے۔ ابھی میلے ٹھیلے کا شوق نہیں گیا؟ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ کہ کہو تو ہم بھی ہو آئیں۔ جیسے میرے ہی کہے میں تو ہیں۔ کنبے میں شادی غمی کے بیسیوں موقعے گذر گئے کہتی رہ گئی۔ کہ وقت گذر جاتا ہے۔ بات رہ جاتی ہے۔ بس ایک دو روز کے لئے مجھے لے چلنے۔ ٹلا ٹلا دیا۔ غضب خدا کا سفید بال ہوتے جھوٹے بہانے لکھ لکھ کر بھیج دئے۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ آج نوچندی کے لئے مجھ سے پوچھنے آئے ہیں۔ کہ کہو تو ہم بھی ہو آئیں!

شوق سے جاؤ۔ مَیں نے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں میرا کیا ہے۔ دنیا کہے گی۔ بوڑھے منہ مہاسے لوگ دیکھیں تماشے۔ باسی کڑھی کا اُبال۔ پڑی کہے۔ مجھے تو جب خیال ہوتا۔ جو میرے کہے میں ہوتے"۔

ایسے موقعوں پر بچے غریب ضرور کوئی خطا کر بیٹھتے ہیں چھٹن دکھیا صحن میں بیٹھا مرغی کے بچوں کو دانہ کھلا رہا تھا چچا کی نظر پڑ گئی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے چھٹن؟ بس صبح ہوئی نہیں۔ اور نیرا مرغی کے بچوں کا کھیل شروع ہو گیا۔ تختی لکھ لی؟ آموختہ دہرایا؟ نالائق کہیں کا۔ سال بھر ہو گیا مولوی صاحب سے پڑھتے۔ ابھی تک لکھنا نہیں سیکھا جب دیکھو مرغی کے بچوں کا کھیل۔ جب دیکھو مرغی کے بچوں کا کھیل۔ یہ ہوتے ہیں اشرافوں کے بچوں کے بچھن؟ مرغ باز بننا ہے تجھے؟ اٹھ یہاں سے۔ چل اپنی کتاب پڑھ"۔

اس کے بعد چچا امامی کو حقہ تازہ کرنے کا حکم دے کر دیوان خانے میں چپ چاپ جا بیٹھے۔

گھنٹے بھر کے بعد چچی نے ادھر سے گزرتے گزرتے دیوان خانے

کا کواڑ کھول کر پوچھا۔" وہ کیا اسباب جائے گا ساتھ؟ بتا دیتے تو بندھ جاتا"۔

چچا نے بیٹھے بیٹھے کڑک کر جواب دیا۔" مَیں نہیں جا رہا"۔

چچی اندر چلی گئیں۔ بولیں۔" یہ بگڑ کس بات پر بیٹھے؟ اے بس اتنی ہی بات تو میرے منہ سے نکل گئی نا۔ کہ کتنے میں سے بلاوے آئے تو ٹال ٹال گئے۔ اور نوچندی جانے کی جھٹ پٹ تیاری کر لی تمہیں کہو۔ کچھ جھوٹ کہا تھا میں نے؟"

چچا نے بگڑ کر کہا۔" بس کان نہ کھاؤ میرے۔ کہہ جو دیا مَیں نہیں جا رہا"۔

چچی کو بھی غصہ آ گیا۔" نہیں جاتے نہ جاؤ۔ میری بلا سے۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی . . . اور نہیں تو"۔

یہ کہ چچی زور سے کواڑ بند کر کے اندر چلی آئیں۔

ذرا سی دیر بعد مُنّے اور نوشاہ آ پہنچے۔ دروازے کی چق اُٹھا کر باہر ہی کھڑے کھڑے بولے۔" بس بس بیٹھیں گے

نہیں اس وقت۔ پوچھنے آئے تھے۔ کہ تیار ہو نہ۔ کہیں عین وقت پر بہانے بنانے بیٹھ جاؤ۔ ساڑھے چار چھوٹ جاتی ہے گاڑی۔ ذرا اس کا خیال رہے"۔

دوپہر تک چچا دیوان خانے ہی میں بیٹھے رہے۔ دے حُقہ پر حُقہ اور پان پہ پان۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں منگوایا۔ امامی جھوٹے برتن اٹھاکر چلنے لگا۔ تو اس سے کہا "دیکھ بیوی سے جاکر کہہ دے اسباب بندھ جائے گا۔ آپ بس ناشتے کا انتظام کر دیجئے"۔

پیغام بھیج کر چچا کان کواڑ سے لگائے سنتے رہے۔ کہ کیا جواب ملتا ہے چچی سُنکر چُپ ہو رہیں۔ تو آپ کواڑ کھول اندر آ گئے۔ دو ایک مرتبہ زنان خانے سے مردانے میں اور مردانے سے زنان خانہ میں آئے گئے۔ کبھی رستے میں تھم گئے مڑنا چاہا۔ نہ مڑے۔ بڑھے چلے آئے۔ پھر یک لخت مُڑ گئے۔ کھڑے ہو کر داڑھی کے بالوں میں سے ٹھوڑی کھجلائی۔ پھر سیدھا اپنے کمرے کا رستہ لیا۔ ذرا ہی دیر کے بعد کرتے کے اندر ہاتھ ڈال کر سینہ کھجلاتے ہوئے باہر نکل آئے۔

کچھ دیر چبوترے پر کھڑے رہے۔ پھر غڑاپ سے اندر۔
آواز آئی "او امامی! یہاں آئیو!"
گھر بھر کے کان کھڑے ہوئے کہ ہوئیں سفر کی
تیاریاں شروع۔
"ذرا جائیو تو بھاگ کر اللہ بخش درزی کے ہاں۔
کہنا میاں آج نوچندی میں جا رہے ہیں۔ انگرکھا سل
گیا ہو تو دے اور نہ سلا ہو تو یاد کر کے کہہ دیجیو
میاں کتنے تھے سلائی نہیں ملنے کی۔ سمجھ گیا؟"
ادھر امامی رخصت ہوا۔ ادھر مودے کی باری آئی
"مودے! ارے او مودے! یہاں آئیو! جانا ذرا تاتادین
کے ہاں + پرسوں اس نے وعدہ کیا تھا کہ آج ہمارے
کپڑے دھو کر دے دے گا۔ اس سے کہیو میاں آج
نوچندی میں جا رہے ہیں۔ کپڑے دُھل گئے ہوں تو دے
دے۔ سمجھ گیا؟ جائیو تو جھپاک سے۔ اور ہاں سننا۔ دو
جوڑے ہیں ہمارے۔ ایک میں غرارہ ہے اور ساتھ ایک
انگرکھا ہے ... ہیں ہے وہ امامی چلا گیا درزی کے

ہاں؟ اب کیا کروں؟ یہ بندو کہاں گیا؟ او بندو! ارے بندو! جانا تو بھاگ کے امامی کے پیچھے اللہ بخش درزی کے ہاں۔ اور اس سے کہیو۔ کہ ایک انگرکھا جو نمونے کا دے رکھا ہے۔ وہ بھی دے دے۔ میاں نوچندی میں جا رہے ہیں نیا انگرکھا سلا ہو یا نہ سلا ہو۔ نمونے کا انگرکھا لے لینا۔ سمجھ گیا؟ دوڑ کر جا ۔ ۔ ۔ ہاں تو کہیو ماتا دین سے۔ کہ میاں نوچندی میں جا رہے ہیں۔ سمجھ گیا؟ دو جوڑے۔ ایک انگرکھا۔ ایک رومال۔ ایک بنیان۔ ایک ازار بند سب چیزیں گن کر بھیجیو۔ اور دیکھنا راستے میں کچھ گرا نہ دینا۔ دیکھوں تو کتنی جلدی آتا ہے"۔

ملازم کام پر روانہ ہو گئے۔ تو اب گھر کے لوگوں کی باری آئی" ارے بھئی کہاں چھپ کر بیٹھ رہے تم سب لوگ؟ کام نظر آیا اور بس ہوئی رد رح فنا۔ یوں نہیں کہ مل ملا کر ختم کر دیں قصہ + ارے بھئی یہاں آؤ۔ تم میرا بستر اٹھا کر لا دو للو + اور تو بیٹی! جاؤ تم غسل خانے میں سے ہماری صابن دانی۔ منجن کی ڈبیا اور تولیا لے

آؤ، چھٹن! ارے چھٹن! جانا اپنی اماں کے کمرے میں۔ وہاں سے ہمارا آئینہ۔ کنگھا اور تیل کی شیشی اٹھا لا۔ سب چیزیں لا کر یہاں فرش پر رکھ دو۔ اور یہ تم کہاں چلے دودو؟ ارے بھئی کہا جو ہے کہ ٹھیرے رہو تھوڑی دیر یہیں۔ جانتے ہو شام کی گاڑی سے نوچندی جا رہا ہوں۔ کام کی یہ کثرت ہے اور سر کُ چلے! جاؤ میرا بکس اٹھا لاؤ۔ اور پھر اپنی چچی اماں سے جا کر کہنا پچھلی دُھلائی آئی تھی۔ تو ہمارے دو رومال آپ کے کپڑوں میں چلے گئے تھے۔ وہ نکال دیں ... تو بیٹی لے آئیں سب چیزیں؟ شاباش شاباش۔ یہاں رکھ دو۔ پر یہ کیا اُٹھا لائیں تم؟ یہ میری منجن دانی ہے سامنے رکھی ہوئی چیز نہیں دکھائی دیتی۔ ارے چھٹن کون سا آئینہ اٹھائے لا رہا ہے۔ بھئی بڑا پریشان کیا ہے ان لوگوں نے۔ ارے احمق ہمارا آئینہ۔ ہمارا آئینہ!"

گھنٹے بھر کی تو تو میں میں کے بعد کہیں سب چیزیں کمرے میں جمع ہوئیں۔ اور چچا نے انہیں بکس میں رکھنا شروع کیا۔ تمام نوکر اور بچے اردلی میں موجود۔ چیزیں یاد

بکس میں جگہ کم۔ چچا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر انہیں ٹھونس رہے ہیں۔ پر کسی طرح نہیں سمائیں۔ زور لگا لگا کر منہ لال ہو رہا ہے۔ پیشانی سے پسینہ کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ ایسے موقع پر کسی بچے کو ہنسی آجانا بڑا خطرناک ہوتا ہے چچا چونک کر مڑتے ہیں "کون تھا یہ؟ نالائق۔ بدتمیز کہیں کے۔ ہنسی کی کیا بات تھی؟ کوئی تماشا ہو رہا ہے یہاں؟ ریل کا وقت سر پر آگیا ہے۔ اور انہیں ہنسی سوجھ رہی ہے۔ نکلو یہاں سے۔ باہر جا کر ہنسو"۔

اِدھر کمرے میں سے قافلہ نکلتا ہے۔ اُدھر آواز آتی ہے "ارے کم بختو۔ کہاں جا کر مر رہے سب کے سب؟ او امامی! ارے او بندو! سانپ سونگھ گیا کیا؟ یہاں آ کر بکس کا ڈھکنا بند کراؤ۔ بیٹھو اس کے اوپر چڑھ کر"۔

بکس بند ہو چکا۔ تو اب بستر کی باری آئی "ابے یوں نہیں۔ یوں۔ اس طرح موڑ۔ اندھے اِدھر دیکھ میں کیا کر رہا ہوں۔ اب لپیٹ۔ اچھی طرح دبا کر۔ جان بھی ہے ہاتھوں میں؟ کھا کھا کر سانڈ تو بن گیا ہے۔ اور بستر

نہیں لپیٹ سکتا؟ ابے اس طرح۔ یوں بس اب بیٹھا رہنا اوپر۔ ہٹیو مت۔ میں نکالتا ہوں رسّی نیچے سے! لاحول! ساری کی کرائی پر پانی پھیر دیا"۔

یہاں بستر ہی سے کشتی ہو رہی تھی۔ اُدھر منّے مرزا اور نوشاہ میاں تیار ہو کر آن بھی پہنچے۔ آوازیں آنی شروع ہو گئیں "اماں چلو۔ اب کیا ہو رہا ہے اندر؟ آدھ گھنٹہ رہ گیا ہے ریل کے چھوٹنے میں۔ ارے بھئی کونسا مہینوں کا سفر ہے کہ رخصت ہونے میں گھنٹے صرف ہو گئے؟ اب نکل بھی چکو گھر میں سے۔ سامان تو بھجوا دو۔ کہ تانگہ میں رکھ دیا جائے"۔

ادھر اندر چچا بستر باندھ رہے ہیں۔ ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں۔ اور پکار پکار کر احکام سنا رہے ہیں "اماں للو! دیکھنا وہ ناشتہ بھی بندھ گیا۔ اپنی اماں سے کہنا ایک لوٹا اور ایلومینیم کا گلاس بھی نکال دیں۔ ارے بھئی ودّو! کسی سے کہو اسباب باہر پہنچانا شروع کرے۔ ہئی ہئی وقت تو بہت ہی تھوڑا رہ گیا۔ ارے بھئی کہہ دو باہر کہ بس ابھی آیا۔

ذرا میری اچکن اور ٹوپی کھونٹی پر سے اتار دینا۔ اور اپنی چچی سے کہنا کچھ روپے بھی سفر خرچ کے لئے نکال دیں۔ اماں آرہا ہوں منتے آرہا ہوں۔ تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوگئے۔ اسباب باندھ رہا تھا۔ بس آیا"۔

اتنے میں چچی کمرے میں آگئیں۔ بولیں" اور یہ نئی وصلی کی جوتی ساتھ نہ لینے گئے؟"

چچا پاگلوں کی طرح مڑکر دیکھتے ہیں۔ نوجوتی بندھنے سے رہ گئی ہے۔" اب کیا کروں؟ ریل کا تو وقت ہوگیا۔ اماں ٹھونس بھی دو بستر میں کہیں۔ نہ تہ یوں تو گر پڑے گی تم کھول لو بستر۔ ارے بھئی جلدی کرو۔ ریل کا تو وقت ہو گیا۔ اماں آرہا ہوں نوشے! چھٹن بیٹے باہر جاکر کہنا اسباب باندھ رہے ہیں۔ ابھی آئے۔ اماں کھول بھی چکو بستر۔ لاحول ولا۔ ارے بھئی کاٹ دو رسیوں کو۔ ذرا سا تو وقت رہ گیا ہے"۔

بستر کھلا پڑا تھا۔ کہ چچی پوچھ بیٹھیں" کوئی موزوں کی جوڑی بھی رکھ لی صندوق میں؟"

چچا بستر چھوڑ چچی کا منہ تکنے لگے موزے؟ رکھ ہی لئے

ہوں گے۔ کہ اللہ جانے رہ گئے! کچھ یاد نہیں آتا۔ ارے بھئی کھولنا جلدی سے صندوق۔ تم بستر باندھو للو + یہ رہی چابی صندوق کی۔ کھولتا ہوں۔ ریل کا تو وقت ہوگیا۔ ارماں ددو جا کر کہنا باہر کہ بس میں آیا کہ آیا۔ تو بیٹی دیکھنا تو ذرا صندوق میں موزے + ارے بھائی بستر نہیں بندھا اب تک؟ اب کہیں باندھ بھی چکو۔ اس کونے میں دیکھیو موزے ہوں گے تو ادھر ہی ہوں گے۔ یہ رکھے تو ہیں۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کرواتی ہیں۔ دوسرے کو تو نرا احمق سمجھ رکھا ہے + ارے بھئی بس بند کرو صندوق۔ یہ نفاستیں رہنے دو۔ چیزیں جیسی ہیں اب پڑی رہیں۔ خدا کے لئے تالا لگاؤ۔ تم کہاں گیا تالا؟ ارے بھئی تالا کون لے گیا۔ کس نے اٹھا لیا تالا؟"

لیجئے تالے کی ڈھنڈیا پڑ گئی۔ جسے دیکھئے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فرش پر تالا تلاش کر رہا ہے۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ چچا جان کے ہاتھ ہی میں تھا۔

چچا شیروانی کی آستینوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے

زنان خانے سے نکلے۔ تو انتظار کر کر کے مُنّے مرزا اور نوشاہ میاں اسٹیشن پر جا چکے تھے۔

"ارے امامی لپک کر کوئی اکّا تو پکڑ۔ ذرا آگے بڑھ کر دیکھ پیسے ٹھیک کر لیجو۔ تم عددگنو للو۔ اور ہمارے ساتھ کون جائے گا؟ دِدّو تم چلنا۔ اور تو امامی۔ اے لو وہ آ گیا اکا۔ اسباب لا دو۔ تم سوار ہو جاؤ دِدّو۔ تو بھی بیٹھ جا امامی۔ پیسے ٹھیرا لیئے نا اکّے والے سے؟ لے میرا بھائی۔ اب ہوا کی طرح چل۔ نوچندی پر جا رہے ہیں ہم۔ ریل کا وقت ہو گیا ہے۔ اُڑ کے چل۔ رہ نہ جائیں گاڑی سے۔ عدد گن لیئے تھے دِدّو؟ اور وہ پانوں کی ڈبیا؟ ہئی ہے۔ خیال ہی نہ رہا۔ چلو نوشے کے پاس ہوں گے پان۔ ارے بھئی ذرا چال دکھا جانور کی۔ ایسے نکمے لوگ ہیں کہ خدا کی پناہ بس ذرا سا کام ہو بوکھلا جاتے ہیں۔ یوں نہیں ذرا مزے مزے آرام سے فارغ ہو جائیں۔ گھنٹوں پہلے تیاری شروع کرو۔ وقت پر وہی جھینکنا۔ عاجز آ گیا ہوں میں تو۔"

خدا خدا کر کے کہیں اسٹیشن پر پہنچنا ہوا۔ وہاں قلیوں سے

بات نہ ٹھیر سکی۔ اچھی خاصی ردّ و قدح کے بعد بکس اور بستر امامی کے سر پر رکھ کر ریل کا رُخ کیا۔ وہاں بابو سے معلوم ہوا کہ ٹکٹ کے بغیر ریل کے سفر کی کوشش جرم ہے۔

چچا لاحول پڑھتے ہوئے ٹکٹ گھر کی طرف دوڑے۔ بابو سے میرٹھ کا ٹکٹ مانگا۔ تو معلوم ہوا کہ کل صبح سے پہلے کوئی گاڑی میرٹھ روانہ نہ ہوگی۔

# چچا چھکن نے دھوبن کو کپڑے دِئے

چچی ایک دو بار نہیں۔ بیسیوں مرتبہ چچا چھکن سے کہہ چکی ہیں۔ کہ باہر تمہارا جو جی چاہے کیا کرو۔ مگر خدا کے لئے گھر کے کسی کام میں دخل نہ دیا کرو۔ آپ بھی ہلکان ہوتے ہو دوسروں کو بھی ہلکان کرتے ہو۔ سارے گھر میں ایک ہڑبڑی سی پڑ جاتی ہے۔ میرا دم الجھنے لگتا ہے۔ اور پھر تمہارے کام میں میں نے نقصان کے سوا کبھی فائدہ ہوتے بھی تو نہیں دیکھا۔ تو ایسا ہاتھ بٹانا بھلا میرے کس کام کا؟

چچا اس قدر ناشناسی سے کھج جاتے ہیں۔ چڑ کر کہتے بھی ہیں۔ بھلا صاحب۔ کان ہوئے۔ پھر کبھی آپ کے

کام میں دخل دیا۔ تو جو چور کی سزا وہ ہماری سزا۔ لیکن دخل در معقولات کا انہیں کچھ ایسا لاعلاج مرض ہے۔ کہ جہاں کوئی موقع ملا پھر لنگوٹ کس تیار۔

آج ہی دوپہر کی سنئے: چچی کا جی اچھا نہ تھا۔ گلا آگیا تھا اس کی وجہ سے ہلکی ہلکی حرارت بھی تھی۔ منہ سر لپیٹے دالان میں پڑی تھیں۔ کہ دھوبن کپڑے لینے آگئی: چچی نے کہا۔ "بڑی ننھی آج تو میرا جی اچھا نہیں۔ کل یا پرسوں آجائیو۔ تو میلے کپڑے دے دوں گی"۔

دھوبن بولی۔ "بیوی جی۔ بڑی ننھا آج رات بھٹی چڑھا رہا تھا۔ کپڑے مل جاتے تو آٹھویں دن میں دے جاتی۔ نہیں تو پھر وہی دس پندرہ دن لگ جائیں گے"۔

چچی نے کہا۔ "اب جو ہو۔ مجھ میں تو اٹھ کر کپڑے دینے کی ہمت نہیں"۔

چچا چھکن پرلے دالان میں بیٹھے میاں مٹھو کو سبق پڑھا رہے تھے۔ کہیں چچی کی بات سن پائی۔ انہیں ایسے موقعے اللہ دے۔ جھٹ ادھر آن پہنچے بولے۔ "کیا بات

ہے ؟ کپڑے دینے ہیں دھوبن کو؟ ہم دئے دیتے ہیں"۔

چچی بولیں "اے خدا کے لئے تم رہنے دینا۔ ہلکم ڈالو گے سارے گھر میں۔ پہلے ہی میرا جی اچھا نہیں ہے کل پرسوں اللہ چاہے تو میں آپ اُٹھ کر دے دوں گی"

چچا کب رکنے والے ہیں بھلا۔ اللہ جانے کام ہی کا جنون ہے۔ یا گھر کے کاموں سے طبیعت کو خاص مناسبت ہے یا روک دئے جانے میں انہیں اپنے سلیقے اور سُگھڑاپے کی توہین نظر آتی ہے بولے "واہ بھلا کوئی بات ہے۔ یہ ایسا کام ہی کیا ہے۔ ابھی نمٹائے دیتے ہیں"۔

چچی جانتی ہیں وقت پر چچا کب کسی کی سنتے ہیں۔ وہ تو بڑبڑاتی ہوئی کروٹ لے پڑ رہیں اور یہ چچا چھکن چلے دھوبن کو کپڑے دینے۔ چچی ٹوک چکی تھیں۔ اس لئے آپ نے نہ تو کسی ملازم کو آواز دی۔ نہ کسی بچے کو بُلایا۔ نہ کسی سے یہ پوچھا۔ کہ کس کے کپڑے کہاں پڑے ہیں۔ خود ہی گھر کے جالے لینے شروع کر دئے۔ جو کپڑا نظر آیا خود ہی آنکھوں کے سامنے تان کر پرکھا۔ یا نیچے پھیلا

کر دیکھ لیا"۔ کم بخت پتہ بھی تو نہیں چلتا۔ کہ پہننے کا کپڑا ہے یا جھاڑن بن چکا ہے۔ چچا روں کے بچے بھی تو اس سے اچھی طرح کپڑا پہنتے ہوں گے"۔ کسی کپڑے کو چھوڑا۔ کسی بغل میں دبایا۔ کہیں جھک کر چارپائی کے نیچے جھانکا۔ کہیں ایڑیاں اُٹھا کر الماری کے اوپر نظر ڈالی۔ معلوم ہوتا تھا۔ آج چچا نے قسم کھالی ہے۔ کہ جو کام ہوگا۔ آپ ہی کریں گے۔ لیکن آخر کب تک؟ چچا چھکن کے لئے تو اللہ میاں ہی نے پیدا کر دیتے ہیں۔ کپڑوں کی تلاش میں اسباب کی کوٹھڑی میں گئے تھے۔ پانچ منٹ بعد اندر سے آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔

"ارے آنا آنا۔ او بندو! او امامی! اماں ددو۔ ارے بھئی للو! کدھر گئے سب! دوڑ کر آنا۔ ہاتھ پھنس گیا۔ اماں ہاتھ پھنس گیا۔ ارے بھئی صندوق کے پیچھے ہاتھ پھنس گیا۔ اماں ہمارا ہاتھ۔ اور کس کا ہوتا۔ یہاں کوٹھڑی میں۔ نہیں نکلتا۔ یہ کیا کرتے ہو؟ عقل ماری گئی ہے۔ ہاتھ کیسے کھنچے گا۔ ارے بھئی صندوق سرکاؤ۔ لاحول ولا۔ اماں زور لگاؤ۔

ایک صندوق نہیں سرکتا سب سے؟ ہل کر۔ ہاں یوں...
توبہ توبہ دیکھتے ہو ہاتھ کو؟ سارا چھل کر رہ گیا ہے۔ دیکھیے ان
بدتمیزوں کے طریقے؟ میلے کپڑے رکھنے کو جگہیں کیا کیا
انوکھی نکالی ہیں۔ صندوقوں کے پیچھے ٹھونسا کرتے ہیں
میلے کپڑے؟ احمق کہیں کے۔ تمہیں کہو۔ یہ جگہیں ہیں کپڑے
رکھنے کی؟ نامعقولوں کو اتنا خیال نہیں آتا۔ کہ آخر یہ کھونٹیاں
کس مرض کی دوا ہیں"۔

لیجئے صاحب حسب معمول سارا گھر چچا میاں کے
گرد جمع ہو گیا۔ اور آپ نے سُنانے شروع کر دئے اپنے
احکام:

"اب کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ جمع کرو میلے
کپڑے۔ پر دیکھو رہ نہ جائے کوئی۔ ایک ایک کونا دیکھ لیجیو
دالان میں ڈھیر لگا دو سب کا۔ بندو تو ہمارے کمرے میں
سے میلے کپڑے سمیٹ لا۔ دو تین جوڑے تو چارپائی کے نیچے
حفاظت سے لپٹے رکھے ہیں۔ وہ لیتا آئیو۔ اور سُننا وہ چھٹن
یا نبّو کا ایک کُرتا بانس پر لپٹا ہُوا کونے میں رکھا ہے۔ پرسوں

کمرے کے جالے اتارے تھے ہم نے۔ وہ بھی کھونٹا لائیو اور دیکھ ... ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے کمبخت۔ پوری بات ایک مرتبہ نہیں سُن لیتا۔ ایک بنیان ہمارا انگیٹھی میں رکھا ہے۔ بوٹ پونچھے تھے اس سے۔ وہ بھی لیتا آنا۔ جا بھاگ کر جا۔ امامی تو بچوں کے کپڑے جمع کر۔ ہر کونے اور طاق کو دیکھ لیجیو۔ یہ بدمعاش کپڑے رکھنے کو نئی سے نئی جگہ نکالتے ہیں۔

نوکر روانہ ہوئے۔ تو بچوں کی باری آگئی۔ "کہاں گئے یہ سب کے سب؟ ادچھٹن! ارے ادچھٹن! لیجئے ملاحظہ فرمائیے آپ کی صورت! ارے یہ کیا حال بنایا ہے؟ کوئلوں میں کہاں جا گھسا تھا؟ اتار اپنے کپڑے۔ نئے کپڑے پھر ملیں گے۔ پہلے میلے کپڑے یہاں لا کر رکھ۔ اور یہ بنّو کدھر گئی؟ میں کہتا ہوں۔ آخر یہ مرض کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو۔ جہاں کام کی صورت دیکھی کھسک جانے کی ٹھیرا لی۔ چلو اندر۔ ایک کاغذ اور پنسل لا کر دو ہمیں۔ آخر لکھے بھی جائیں گے کپڑے یا نہیں؟ للّو۔ تم بستروں میں سے میلی

چادریں اور تکیوں کے غلاف نکال لاؤ۔"

غرض ایک پانچ منٹ میں گھر کی یہ حالت ہو گئی گویا آنکھ مچولی کھیلی جا رہی ہے۔ کوئی اِدھر بھاگ رہا ہے۔ کوئی اُدھر۔ کوئی چارپائی کے نیچے سے نکل رہا ہے۔ کوئی کونے جھانکتا پھر رہا ہے۔ کسی نے لپٹے ہوئے بستر سے کشتی شروع کر رکھی ہے۔ کوئی کپڑے اتار تولیا لپیٹے بھاگا جا رہا ہے، ساتھ ساتھ چچا کے نعرے بھی سننے میں آ رہے ہیں۔ "ارے آئے؟ ابے لائے؟" سب کے ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں سٹی گم ہے۔ ٹکریں لگ رہی ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹے کی محنت سے سارے کپڑے دالان میں جمع ہوئے۔ نوکر اور بچے کپڑوں کے ڈھیر کے گرد دائرہ باندھے کھڑے ہیں۔ صورتیں سب کی ایسی ہیں۔ گویا سوانگ بھر رکھا ہے۔ کسی کے منہ پر مٹی پڑی ہے۔ کسی کے بال مٹیالے ہو رہے ہیں۔ کسی کے کپڑوں پر جالے لگے ہوئے ہیں۔ چچا چارپائی پر بیٹھے ایک ایک کپڑے کا معائنہ فرما رہے ہیں۔ ہر کپڑے کو انگلی کے سروں سے

اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ کبھی بچوں کو کوستے ہیں۔ کہ کمبختوں کو کپڑا پہننے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ کبھی دھوبن کو ڈانٹتے ہیں۔ کہ خبردار جو ایک داغ بھی باقی رہا۔ کہیں بیچ میں وہ بنیان بھی ہاتھ میں آ گیا۔ جس سے آپ نے بوٹ پونچھے تھے۔ خیال نہ رہا۔ کہ یہ اپنی ہی کارروائی ہے۔ برس پڑے "اب دیکھو تو اس کی حالت۔ یہ انسانوں کا برتا ہؤا معلوم ہوتا ہے؟ اللہ جانے بدتہذیب کہاں کہاں "

داغ اچھی طرح دیکھنے سے چچا کو یاد آ گیا۔ کہ یہ بنیان ان کے اپنے کمرے کی انگیٹھی میں سے برآمد ہؤا ہو گا چنانچہ فوراً کپڑوں میں ملا دیا۔ اور ارشاد ہؤا "چلو اب جو ہے سو ہے۔ لو اب کپڑوں کو الگ الگ کر دو۔ کہ کون سا کپڑا کس کا ہے"

دس ہاتھ کپڑے الگ الگ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ہر ایک کو اپنی کارگذاری دکھانے کا خیال۔ دھوبن چیخ رہی ہے۔ اے میاں جانے دو۔ اے بھائی رہنے دو۔ میں ابھی آپ الگ کر دوں گی۔ مگر بچے

کہاں سنتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ یہ میری قمیص ہے۔ کوئی کہتا ہے تمہاری کہاں سے آئی یہ تو میری ہے۔ کسی کا کوٹ پر جھگڑا ہے۔ کسی کا واسکٹ پر۔ کوئی کُرتے کی ایک آستین کھینچ رہا ہے۔ کوئی دوسری۔ کسی کی پاجامے کے پائینچوں پر کسی سے رسّہ کشی ہو رہی ہے۔ کپڑے چر ر چر ر کر کے پھٹ رہے ہیں۔ چچا سب کے ناموں کی فہرست بنانے میں مشغول ہیں۔ بیچ میں سر اٹھا اٹھا کر ڈانٹتے بھی جا رہے ہیں۔ "کہا دیا نا؟ اب کے بنانے کو کبھو کوئی نیا کپڑا۔ جو ٹاٹ کے کپڑے نہ بنا کر دئے ہوں۔ چلے جاؤ سب یہاں سے ہم اکیلے سب کام کر لیں گے"۔

بچوں اور نوکروں کا قافلہ رخصت ہوا۔ اور دھوبن کے ساتھ مل کر فہرست بننی شروع ہوئی۔ اسے ہدایات دی گئیں۔ کہ دیکھ ہم پوری فہرست بنائیں گے کپڑوں کی سب کے کپڑے جُدا جُدا لکھوانے ہوں گے۔ اور ساتھ ہی بتانا ہوگا۔ کہ اتنے کپڑے گرم ہیں۔ اتنے ریشمی۔ اتنے سُوتی۔

دھوبن بولی "یوں ہی تو ہمیشہ لکھے جاتے ہیں"۔

چچا کو اپنی اس قابل قدر اور مہتم بالشان تجویز کی داد نہ ملی۔ تو آپ دھوبن سے چڑ گئے "پگلی کہیں کی۔ ہر روز تو گھر میں ہلڑ مچا رہتا ہے کہ اس کی قمیص بدل گئی اس کا پاجامہ نہیں ملتا۔ اور کہتی ہے کہ یونہی لکھے جاتے ہیں کپڑے۔ یوں کسی کو لکھنا آتا۔ تو یہ روز کی جھک جھک کیوں ہوا کرتی؟"

دھوبن چپکی ہو رہی۔ کپڑے گننے شروع کر دئے۔ پر اب پہلے ہی کپڑے پر نئی بحث چھڑ گئی۔ دھوبن کہے کہ قمیص چھٹن میاں کی ہے یہ۔ چچا مصر ہیں کہ نہیں بنو کی ہے۔ دھوبن کہتی ہے "میں کیا پہلی بار کپڑے لے جا رہی ہوں۔ اتنی بھی پہچان نہیں مجھ کو؟" چچا کہتے ہیں "احمق کہیں کی۔ کپڑا بازار سے لاتے ہیں ہم۔ سلواتے ہیں ہم۔ روز بچوں کو پہنے ہوئے دیکھتے ہیں ہم۔ اور پہچان تجھے ہوگی؟" شہادت کے لئے بندو کو بلوایا گیا۔ چچا نے اس سے پوچھا۔ "یہ قمیص بنو ہی کی ہے نا؟" بندو کی کیا مجال کہ میاں کی تردید کرے

ڈرتا ڈرتا بولا "معلوم تو کچھ ان ہی کی سی ہوتی ہے۔ پر وہ آپ ہی ٹھیک بتائیں گی"۔ بنو کی طلبی ہوئی۔ وہ آتے ہی بولیں "واہ یہ پھٹی پرانی قمیص میری کیوں ہوتی چھٹن ہی کی ہوگی"۔

دھوبن کو چچا کے مزاج کی کیفیت کیا معلوم۔ کہہ بیٹھی "میں نہ کہتی تھی"۔ چچا کو آگ لگ گئی۔ اولیا کی بچی ہیں نہ یہ تو۔ انہیں کیوں نہ معلوم ہوگا منہ پھٹ بدتمیز کہیں کی۔ دوسرا دھوبی رکھ لوں گا میں"۔

کامل ایک گھنٹے کی محنت کے بعد کہیں فہرست بن کر تیار ہوئی۔ کہ کون سا کپڑا کس کا ہے۔ اور کس کے کپڑے کتنے ہیں۔ اب جناب ادھر دھوبن سے کہا گیا۔ کہ تو سب کے کپڑے گن۔ ادھر اپنی فہرست کی میزان ملانی شروع کی۔ دھوبن گنتی ہے تو انسٹھ عدد بنتے ہیں۔ چچا اپنی میزان ملاتے ہیں۔ تو اکسٹھ کپڑے ہوتے ہیں۔ دھوبن بار بار کہتی ہے "میاں ٹھیک طرح جوڑو۔ انسٹھ ہی ہیں"۔ پر چچا ہیں کہ بگڑے جا رہے ہیں۔ "تیرا جوڑنا ٹھیک

اور ہمارا جوڑنا غلط ہو گیا؟ جاہل کہیں کی۔ اُٹھ کر دیکھ۔ نیچے دبائے بیٹھی ہوگی" دھوبن غریب ہر طرف دیکھتی ہے۔ بار بار کپڑے گنتی ہے وہی انسٹھ نکلتے ہیں۔ چچا کی نظروں کے سامنے بھی ایک بار گن دیئے انسٹھ ہی نکلے آخر نئے سرے سے تمام کپڑوں کا مقابلہ کیا گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا۔ کہ دھوبن نے بتائے تھے دو جوڑی موزے۔ اور چچا میاں نے لکھے تھے چار دھوبن انہیں دو عدد گنتی تھی۔ اور چچا چار عدد۔ اس پر پھر بچاری دھوبن کے لتے لئے گئے تھے "جوڑی کیا معنی؟ چار نہیں تھے موزے؟ یوں تو چار رومالوں کو بھی دو جوڑی لکھوا دے تو یہ ہمارا قصور ہوگا؟ لے کر آپنا وقت مفت میں ضائع کروا دیا۔ ساری عمر کپڑے دھوتے گزر گئی اور ابھی تک کپڑے گننے کا سلیقہ نہیں آیا"۔

بارہ بجے دھوبن آئی تھی۔ چار بجے رخصت ہوئی۔ چچا چھکن فراغت پانے کے بعد فہرست چچی کو دینے آئے بولے "نمٹا دیا ہم نے دھوبن کو"۔

چچی جلی ہوئی تھیں۔ بولیں "گھر پر قیامت بھی تو گزر گئی کوئی بچہ ننگ دھڑنگ پھر رہا ہے۔ کوئی غسل خانے میں کپڑوں کے لئے غل مچا رہا ہے۔ دھوبن دکھیا الگ کھسیانی ہو کر گئی ہے۔ آدھا دن برباد کر کے کس مزے میں کہتے ہیں کہ نمٹا دیا ہم نے دھوبن کو"۔

چچا چڑ گئے۔ "تمہیں کبھی پھوٹے منہ سے داد کے دو لفظ کہنے کی توفیق نہ ہوئی"۔

چچا روٹھ کر چارپائی پر پڑ رہے۔

چچی نے پوچھا "پاجاموں میں سے ازاربند بھی نکال لئے تھے؟"

چچا کی آنکھیں کچھ کھلیں۔ مگر جواب نہ دیا۔ بڑے مناسب وقت پر روٹھ گئے تھے۔

اتنے میں فہرست دیکھ کر چچی بولیں "اور یہ میری ریشمی قمیص کون سی؟ ہلکے فیروزی رنگ کی؟ اے غضب خدا کا۔ میں نے تو وہ استری کرنے کو الگ رکھی تھی۔ کمبخت دو کوڑی کی کر لائے گی۔ اور اس میں سے میرے سونے کے

بٹن بھی اتار لیے نھے یا نہیں ؟"

اب تک تو چچا کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ سونے کے بٹنوں کا سنا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"بٹن ؟ سونے کے ؟ تمہارے ؟ تمہیں میری قسم ! ہٹی ہے وہ تو نہیں اتارے ہم نے۔"

جوتی پہنتے ہوئے چچا باہر بھاگے۔"ارے بھئی چلی گئی دھوبن! او بندو چلی گئی دھوبن! ارے امامی کدھر گئی دھوبن ؟ ارے دوڑیو۔ ارے بھئی جانا۔ پکڑنا۔ لے کر آؤ۔ منہ کیا تکتے ہو۔ سونے کے بٹن لے گئی۔ اماں سونے کے بٹن ۔ تمہاری چچی کے۔ اس کا گھر کدھر ہے ؟ چوک سے مڑ کر کدھر کو ؟ اماں خونچے والے کسی دھوبن کو جاتے دیکھا ہے ؟ ارے بھئی ریوڑیوں والے کوئی دھوبن ادھر نہیں گئی ؟ او بھائی گنڈیریوں والے کوئی دھوبن . . . دائیں ہاتھ کو۔ اس طرف کو ؟ . . ."

ابھی تک چچا بٹن لے کر واپس نہیں آئے۔

# چچا چھکّن نے ایک بات سُنی

جانتا بھی تھا۔ کہ چچا چھکن میں مسلسل دو منٹ کسی کی بات سننے کی تاب نہیں۔ بیچ میں میخ نکالنا ان کی عادت ہے۔ بات کاٹے بغیر ان سے رہا نہیں جاتا۔ لفظ لفظ پر ٹوکتے ہیں۔ مگر ہونی شدنی۔ ہوگئی حماقت۔ رات کو اپنے دوست پنڈت درگا پرشاد کو کھانے پر بلا رکھا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد انگیٹھی بیچ میں رکھے گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے مزے سے چاندنی پر نیم دراز تھے۔ سامنے چلغوزوں کے ڈھیر لگے تھے۔ کھا بھی رہے تھے۔ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ سردی سا سماں ہوا تھا۔ اطمینان

اور بے فکری سے بیٹھے ہوں۔ اور پنڈت جی کا دل بولنے کو چاہ رہا ہو۔ تو یوں سمجھئے پھول جھڑتے ہیں منہ سے۔ جی چاہتا ہے صحبت جمی رہے۔ اور یوں ہی بیٹھے ان کی باتیں سنا کریں۔ جو بات ہو ایسے سلیقے اور شستگی سے کہتے ہیں اور اپنے انداز بیان سے اس میں ایسی جان سی ڈال دیتے ہیں۔ کہ سماں بندھ جاتا ہے۔

پنڈت جی ہمیں اپنے ایک سفر کا واقعہ سنا رہے تھے کہ انہوں نے کس طرح ایک اسٹیشن پر گاڑی بدلتے وقت درجے میں آموں کی ایک گٹھڑی رکھی دیکھی۔ اور اسے لاوارث سمجھ کر اپنے اسباب میں شامل کر لیا۔ اس کے کچھ آم تو مزے لے لے کر کھائے۔ کچھ آموں سے پیدل سڑک کے مسافروں کا نشانہ بناتے رہے۔ پھر اس خیال سے ڈر کر کہ کہیں چوری کھل نہ جائے۔ باقی آم اور نئی دوہر جس میں یہ لپٹے ہوئے تھے۔ چلتی گاڑی میں سے باہر پھینک دی۔ یوں اپنی چوری کے تمام سراغ مٹا کر بڑی تسلی سے سفر کرتے رہے۔ لیکن مزہ منزل مقصود پر اپنے گھر پہنچ کر

آیا۔ جب پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں۔ کہ گھر کی ماما کسی چیز کو تلاش کرتی ہوئی باہر نکلی اور بولی "میاں میں نے ریل میں سوار ہوتے وقت اپنی نئی دوہر جس میں سو قلمی آم بندھے تھے۔ آپ کے درجے میں رکھ دی تھی وہ اسباب میں نظر نہیں آتی"۔

پنڈت جی نے یہ واقعہ ایسے مزے سے بیان کیا۔ اور آخر میں ایسی مضحکہ انگیز صورت بنا کر اپنی حماقت کا اعتراف کیا۔ کہ ہنسی کے مارے سب کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ ہماری ہنسی کی آواز کہیں چچا چھکن کے کان میں بھی پہنچ گئی۔ دروازہ کھول کر پوچھنے لگے "ارے بھئی کیا واقعہ ہوا۔ جو یہ قہقہے اُڑ رہے ہیں؟"

ہم سب کھڑے ہو گئے۔ پنڈت جی آداب بجا لائے محجوب سے نظر آئے۔ تو چچا نے ان ہی سے پوچھا۔ "ارے بھئی پنڈت۔ یہ کیا پھلجھڑیاں چھوڑ رہے ہو۔ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ؟"

پنڈت جی نے شرما کر جواب دیا۔ "کچھ نہیں صاحب

یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں"۔

بیٹھے بٹھائے میری جو شامت آئے۔ کہیں کہہ بیٹھا "پنڈت جی۔ یہ ریل کا قصہ تو چچا میاں کو بھی سنا دیجئے"۔

چچا چھکن عام طور سے تو جلدی سو رہنے کے عادی ہیں۔ لیکن اس وقت تو جیسے اشارے کے منتظر کھڑے تھے پنڈت جی ہاں یا نہیں بھی نہ کرنے پائے تھے۔ کہ کواڑ کھول یہ کہتے ہوئے اندر تشریف لے آئے "ہاں پنڈت جی ہم بھی تو سنیں۔ وہ ریل کا کیا قصہ ہے؟"

یہ کہہ کر چچا انگیٹھی کے قریب پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے رضائی کو ازسرِ نو تکلف سے اوڑھا۔ کندھوں پر ڈالا۔ زانوؤں کے نیچے دبایا۔ کنٹوپ پر ہاتھ پھیر کر اسے سر پر ٹھیک جمایا۔ ذرا دیر اس کے بند سے شغل کیا۔ باندھنا چاہا۔ نہ باندھا۔ پھر ذرا ہاتھ سینکے۔ پہلو کو جھک کر خاصدان کا جائزہ لیا۔ بولے "ہاں پنڈت جی۔ تو کیا قصہ ہے وہ؟"

پنڈت جی ابھی زبان بھی کھولنے نہ پائے تھے۔ کہ ارشاد ہوا "حقہ نہیں پیتے پنڈت جی؟" انہوں نے بہ مشکل

"جی نہیں" کہا ہوگا۔ کہ بولے" بھلا حقے کے بغیر بات چیت کا کیا مزہ؟"

زنان خانے کی طرف منہ کر بندو اور امامی کو آواز دینی شروع کردیں۔" ارے یہاں آؤ! سنتے ہو! یہاں آؤ کوئی! ابے نہیں سنا؟ کان چور لے گئے کیا؟ او بندو! او امامی! کہاں مرگئے کم بختو! دیکھا۔ بس سوگئے دونوں کے دونوں۔ ان بدمعاشوں کو ایسی سرشام سونے کی عادت پڑی ہے۔ کہ فکر ہی نہیں رہی کسی بات کی۔ ابے آتے ہو یا میں آؤں؟ لاحول ولا۔ بھئی بڑے حرام خور ہیں یہ لونڈے۔ قصور سارا تمہاری چچی کا ہے۔ شام سے روٹی دے دلا کر کم بختوں کو نچنت کر دیتی ہیں۔ خیر۔ جی تو پنڈت جی۔ کیا تھا وہ قصہ؟ مگر کچھ مزہ نہیں بات چیت کا حقہ کے بغیر۔ ار بھئی للّو۔ ذرا تم جا کر حقہ نہیں بھر لاتے؟ شاباش شاباش۔ جیتے رہو۔ مگر دیکھنا ذرا تازہ کر لینا حقہ۔ سمجھ گئے نہ؟ اور سننا تو ارکھ کر لانا۔ اور بات تو سنو۔ بڑا عیب ہے تم لوگوں میں کہ آدھی بات سن کر چل پڑتے ہو۔ طاق میں

سے خمیرہ لے لینا۔ آج ہی آیا ہے لکھنؤ سے۔ پندرہ روپے سیر کے حساب سے۔ کچھ سادہ تمباکو اس میں ملا لینا۔ بڑا مہنگا ہو گیا ہے خمیرہ صاحب۔ خود اپنے زمانے کی بات کہتا ہوں۔ کہ پانچ روپے سیر کے حساب سے خریدا ہے مَیں نے۔ ایک دکان تھی لکھنؤ میں جینے جینے کی۔ مگر صاحب واہ واہ! کیا بناتا تھا خمیرہ۔ کش لگاتے ہی ارواح خوش ہو جاتی تھی جب لکھنؤ جانا۔ اس کے ہاں سے اکٹھا خرید لاتا تھا۔ اور اب تو وہ بات ہی نہیں رہی تمباکو میں۔ کہنے کو خمیرہ کہئے یا جو جی چاہے۔ نرا گوبر ہوتا ہے۔ خیر۔ تو ہاں وہ قصہ کیا تھا پنڈت جی؟"

پنڈت جی اتنا ہی کہنے پائے تھے۔" اجی قصہ کیا ہوتا یوں ہی ایک بات سنا رہا تھا سفر کی۔ عرض کئے دیتا ہوں کہ اتنے میں چچا کی نظر چھٹن پر پڑ گئی۔" ارے یہ چھٹن بھی ہے یہاں؟ کیسا دبک کر بیٹھا ہے۔ کہ نظر تک نہ آیا مجھے۔ ارے سویا نہیں تو اب تک؟ صبح اٹھے گا کیسے؟ ملّا جی باہر کھڑے چیخا کریں گے۔ اور پڑا چارپائی پر کسمسایا کریگا

چل اندر۔ ہیں اُوں اُوں؟ اُوں اُوں کیا معنی؟ اب اُوں اُوں کر دیا رُوں رُوں۔ جا کر سونا ہوگا۔ نا صاحب عادت بگڑتی ہے بچے کی۔ چلو جا کر سوؤ۔ ۔ ۔ جی تو پھر؟ میں نے کہا خاصدان میں پان کا ٹکڑا بھی ہے کوئی؟ ذرا تم جا کر ہمیں لے آنا۔ دو؟ ساتھ ہی مراد آبادی تمباکو بھی رکھتے لانا۔ جی تو پنڈت جی پھر۔ غرضیکہ سفر کیا تھا آپ نے خوب؟"

پنڈت جی بولے "پچھلی گرمیوں مراد آباد میں ایک عزیز کی شادی تھی۔ سواریوں کو وہاں پہنچانے کے لئے میرٹھ سے میں اور میرا چھوٹا بھائی روانہ ہوئے۔ ہاپڑ جنکشن پر گاڑی بدلنی تھی۔ وہاں جو اترے ۔ ۔ ۔"

"کہاں؟"

"میرٹھ سے مراد آباد جاتے ہوئے گاڑی ہاپڑ جنکشن پر بدلنی پڑتی ہے۔"

"یہ میرٹھ اور مراد آباد کے راستے میں ہاپڑ کہاں سے آگیا؟"

"صاحب مجھے تو یہی راستہ معلوم ہے۔"

"اور جو دوسرا راستہ ہو؟"

"کم از کم نزدیک کا راستہ تو یہی ہے۔"

"اسے لیجئے۔ اب دور نزدیک پر آ گئے۔ یوں ہی سہی ہماری آدھی عمر بھی ریلوں ہی کا سفر کرتے گذری ہے۔ میں آپ کو میل ٹرین کا راستہ بتاتا ہوں۔ پھر تو دور نزدیک کا مسئلہ بھی ہو جائے گا حل؟ سنئے میرٹھ سے جائیے سہارنپور سمجھ گئے؟ اور جناب سہارنپور سے لکسر۔ لکسر سے نجیب آباد . . ."

"کلکتہ میل کا راستہ؟"

"اب بیچ میں نہ ٹوکئے۔ پورا راستہ سن لیجئے مجھ سے نجیب آباد سے نگینہ۔ نگینہ سے دھام پور۔ اور جناب دھام پور سے مراد آباد۔ آیا سمجھ میں؟ یہی گاڑی آگے شاہجہانپور لکھنؤ۔ بنارس کی طرف نکل جاتی ہے۔ مگر اس موقع پر اس کے تذکرے سے کیا حاصل۔ ہمیں تو صرف مراد آباد کے راستے سے سروکار ہے۔"

پنڈت جی نے کہا۔ "جی ہاں یہ راستہ تو میل ٹرین ہی کا ہے۔ مگر دور کا ہے۔ میں قریب ترین راستے سے روانہ ہوا تھا۔"

چچا نے فرمایا۔ "یوں آپ کو ہر راستے سے روانہ ہونے کا اختیار تھا۔ لیکن یہ خیال آپ کا صحیح نہیں۔ کہ ہمارا بتایا ہوا راستہ دُور کا ہے۔ اور یقین نہ ہو۔ تو ٹائم ٹیبل دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیجئے۔ ٹائم ٹیبل شاید موجود نہ ہو گھر میں۔ ورنہ ابھی طے ہو جاتی بات۔ پر خیر۔ بالفرض وہ راستہ دور کا بھی تھا۔ جب بھی یہ غلطی تھی آپ کی کہ سواریوں کو ساتھ لے کر ایسے راستے سے گئے۔ جدھر سے گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔"

پنڈت جی دبی زبان سے بولے۔ "اس راستے بھی سہارنپور پر گاڑی بدلنے کی ضرورت ہوتی۔"

چچا کنٹوپ کے بند باندھنے لگے۔ "بدلنے کی ضرورت ہوتی؟ یقین ہے؟ اچھا؟ پھر تو کچھ ایسی غلطی نہیں کی آپ نے۔ خیر وہ کسی راستے ہی گئے نہ آپ۔ اب اس بعد از وقت

بحث سے کیا حاصل۔ آپ بات کہئے نا"۔

پنڈت جی نے کہا "تو صاحب اسباب تھا ہمارے ساتھ زیادہ"۔

چچا نے حاشیہ آرائی کی "وہ تو ہونا ہی تھا۔ آخر شادی بیاہ میں جا رہے تھے۔ اور پھر ساتھ سواریاں۔ کچھ نہ پوچھئے ایسے موقعوں پر یہ عورتیں کیا کچھ سامان ساتھ لے کر نکلتی ہیں۔ ٹرنک اور بکس اور گٹھڑیاں اور بستر اور جانے کیا کیا۔ اُف وہ میرا تو سوچ سے بھی دم اُلجھتا ہے"۔

پنڈت جی بولے "جی ہاں۔ تو ہاپڑ میں ہم اتنے اپنے درجے سے اسباب اُتاریں۔ ہاپڑ اترنے والے مسافر اسٹیشن سے باہر چلے گئے۔ جب ہم سارا اسباب اُتار چکے۔ تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ درجے میں اوپر کے تختے پر ایک گٹھڑی رکھی ہوئی ہے۔ جو ہماری نہ تھی"۔

ددّو پان لے کر آ گیا۔ چچا پان کھانے میں مصروف ہو گئے۔ پنڈت جی ان کی توجہ دوسری طرف دیکھ کر رک گئے۔ تو تقاضا ہوا "آپ کہے جائیے۔ میں سُن رہا ہوں"

پان کھول کر کتھا چونا دیکھا۔ کتھا زیادہ تھا۔ زیرِ لب کچھ اُس پر تنقید ہوئی۔" اب تک پان لگانے کا سلیقہ بھی نہیں آیا۔ اچھا خاصا پلستر ہے کتھے کا۔ لاحول ولا" کتھا پونچھا پان کھایا۔ چھالیا تمباکو ہتھیلی پر رکھ کر پھنکی لگائی۔ پان کلے میں دبایا۔ پنڈت جی کی دلداری کو مسکرا کر فرمایا۔" آپ تو خاموش ہو گئے پنڈت جی؟"

پنڈت جی بے صبری سے اس عمل کے تمام ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ چچا کو متوجہ دیکھ کر پھر شروع ہو گئے۔

"ساری ٹرین خالی ہو چکی تھی۔ چنانچہ یقین تھا۔ کہ اب مالک نہ آئے گا۔ دل میں شوق پیدا ہوا۔ کہ گٹھڑی کھول کر دیکھئے تو اس میں کیا ہے، میں نے اسے اٹھا کر کھولا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ سہارن پور کے نہایت اعلیٰ درجے کے مالدہ آم قریب ایک سو کے رکھے ہیں!"

چچا منہ اونچا کر کے پیک سنبھالتے ہوئے بولے۔ "اے بھئی۔ ذرا اُالدان بڑھانا۔" پیک تھوکی۔ باچھیں

پوچھیں + بولے :-

"یہ سہارنپور کے کیسے آم کہے آپ نے؟ مالدہ آم! اور سہارنپور کے؟ بھلا سہارنپور میں مالدہ آم کہاں سے آیا؟ اماں یہ تم پنجاب کی طرف کے اضلاع کے لوگ آموں کی قسموں کے صحیح نام بھی نہیں جانتے؟ مالدہ آم ہوتا ہے بڑا سا۔ پھیکا پھیکا۔ ریشہ دار۔ جسے تم لوگ بمبئی کا آم کہتے ہو+ اور یہ جو سہارنپور کا قلمی آم ہوتا ہے۔ یہ ہے اصل میں بمبئی کا آم۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ آپ اپنا قصّہ جاری رکھئے"۔

پنڈت جی بے چاروں پر اب تک کچھ اوس سی پڑگئی تھی۔ مگر تقاضا سنکر پھر شروع ہو گئے۔

"اگرچہ وہ بیگانہ مال تھا۔ اور ہمیں کسی طرح اس کا کھانا مناسب نہ تھا۔ مگر عمر کا تقاضا۔ تنہائی کا موقع۔ اور نہایت پکّے آم۔ رہا نہ گیا۔ ہم نے سوچا۔ اب کون انہیں ریل والوں کے سپرد کرتا پھرے۔ اور ریل والے ہی ایسے کہاں کے ایماندار ہیں۔ کہ مالک کو واپس کر دیں گے

چنانچہ وہ آم بھی ہم نے اپنے اسباب میں شامل کر لئے"۔

اس پر چچا نے ایک دلداری کا قہقہہ لگایا۔ اور بولے" غرضیکہ خوب آم ملے کھانے کو۔ نہایت دل چسپ واقعہ ہے"۔

پنڈت بے چارہ حیران کہ یہ ادھ بیچ میں داد کیسی! دو تین دفعہ کہنے کی کوشش بھی کی کہ صاحب باقی بات تو سُن لیجئے۔ مگر چچا نے مربیانہ انداز میں سر ہلا ہلا کر انہیں بولنے کی مہلت ہی نہ دی۔ کہنے لگے" سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔ خوب آم اُڑائے پھر۔ نہایت خوب۔ ہمیں بھی ایک مرتبہ اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ مرادآباد سے الہ آباد جا رہے تھے ہم۔ راستے میں پڑا وہ جنکشن۔ وہ ہے نہ۔ کیا نام ہے اس کا؟ وہ۔ اے لو یہ۔ دیکھو اچھا سا نام ہے۔ زبان پر پھر رہا ہے۔ یاد نہیں آتا۔ اماں وہ ہے نہیں جنکشن جہاں سے وہ چھوٹی لائن کسی طرف کو جاتی ہے۔ نہیں تو یاد ہو گا للّو۔ تم ہی تو تھے ہمارے ساتھ۔ نہیں کیسے؟ واہ! ہم خود تمہیں لے کر گئے تھے ساتھ۔ یاد نہیں۔ وہ تمہارا آدھا ٹکٹ لے لینے پر

ٹکٹ بابو سے قصہ ہو گیا تھا؟ اور نہیں تو کیا۔ ارے بھئی الہ آباد جاتے ہوئے ہی تو۔ فیض آباد؟ اچھا؟ فیض آباد! ٹھیک ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ تم فیض آباد کے سفر میں ساتھ تھے۔ خیر اُس کا اِس موقع پر کیا ذکر۔ تو وہ صاحب نہ معلوم کیا نام تھا اس جنکشن کا۔ خیر وہ کچھ ہی تھا۔ نام معلوم ہونا بھی ایسا کیا ضروری ہے۔ تو وہاں سے ایک لالہ ہمارے درجے میں سوار ہوئے، وہ بھی یوں ہی اپنی ایک کوری ہنڈیا جس میں پیڑے تھے۔ درجے میں چھوڑ گئے تھے، وہ بعد میں ہمارے ہاتھ لگی۔ تو اس قسم کے دلچسپ واقعات اکثر ریل کے سفر میں درپیش آتے رہتے ہیں"۔

چچا نے بات ختم کر کے خاص طور پر توجہ کی۔ محفل پر خاموشی طاری ہو گئی۔ پنڈت بے چارے کی حالت عجیب تھی۔ فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ بات ختم کرے یا چُپ ہو رہے آخر میں نے ان کی پریشانی رفع کرنے کے لئے کہا "تو پنڈت جی بات تو ختم کیجئے"۔

چچا چونک کر بولے "اچھا ابھی باقی ہے بات؟ لیجئے

ہم تو سمجھے تھے ختم ہو گئی۔ تو بھلا آپ نے ادھ بیچ میں کیوں چھوڑ دی؟ فرمایئے نا۔ میں ہمہ تن گوش ہوں"۔

پنڈت نے بے بسی کے انداز میں ہم سب کو دیکھا اور پھر شروع ہو گیا۔ "اتفاق سے ہم دوسری گاڑی کے جس درجے میں سوار ہوئے۔ اس میں اور کوئی مسافر نہ تھا۔ بے فکری سے آم کھانے شروع کر دیے"۔

"تراش کر کھائے ہوں گے؟"

پنڈت جی نے کہا۔ "جی نہیں چوسے ہی تھے۔ غالباً چاقو جیب میں موجود نہ تھا"۔

چچا نے زیادہ تعرض نہ کیا۔ "خیر خیر۔ کیا مضائقہ ہے سفر میں چھوٹی موٹی چیزیں ساتھ لے جانی کہاں یاد رہتی ہیں۔ پر چوسنے میں مزہ نہیں رہتا قلمی آم کا"۔

پنڈت جی نے ایک دو منٹ وقفے میں انتظار کیا۔ کہ شاید چچا کچھ اور بھی فرمائیں۔ وہ خاموش رہے۔ تو بات آگے شروع کر دی۔ "دس بارہ ہی آم کھائے پیٹ بھر گیا۔ دو چار اور زبردستی کھائے۔ جب دیکھا کہ بس

اَوْر حلق سے نیچے نہیں اترنے۔ اور رسید کی ڈکار پر ڈکار آرہی ہے۔ تو ہاتھ منہ دھوا اُٹھ کھڑے ہوئے، پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ اور اللہ کا شکر ادا کیا . . .“

چچا چھکن نے پھر ایک حاشیہ چڑھایا۔ ”کہ بے مانگے ایسی مزیدار نعمت عطا فرمائی“۔

پنڈت جی اب ان حاشیہ آرائیوں سے ایسے خائف ہو گئے تھے۔ کہ چچا کی بات ختم ہو جانے کے بعد بھی ان کی زبان نہ کھلتی تھی۔ کچھ تو الجھن کی وجہ سے حواس غائب ہو جاتے۔ کچھ یہ اندیشہ ہوتا۔ کہ بات ابھی اَوْر باقی نہ ہو۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد انہوں نے ذرا تیزی سے داستان بیان کرنی شروع کر دی۔

”پیٹ بھرے پر سوجھی شرارت، ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ پیدل مسافروں کی سڑک تھی، اس پر مسافر آجا رہے تھے۔ ان پر آموں کی گُٹھلی یا ڈمارنی شروع کر دی، جس کے نشانہ ٹھیک بیٹھتا۔ وہ تو سر پکڑ کر سوچتا رہ جاتا۔ کہ یہ آسمانی گولہ کہاں سے آیا، جو وار خالی جاتا۔

اس کی بدولت مسافروں کو مفت کا آم کھانے کو ہاتھ آتا۔"

"بھئی واہ وا۔ لے آئے حقّہ؟ بس رکھ دو یہیں پر . . . تو غرضیکہ پنڈت جی ایک کھیل ہاتھ آگیا آپ کے۔ . . . تازہ کرلیا تھا نہ حقّہ؟ . . . جی تو پنڈت جی۔ اَور کیا رہ گیا؟ . . . تو انہ رکھ کر لائے۔ حالانکہ کہہ بھی دیا تھا میں نے۔ اور خود بھی دیکھ رہے تھے۔ کہ چار آدمی بیٹھے ہیں۔ محفل جمی ہوئی ہے۔ باتیں ہو رہی ہیں۔ بڑے نالائق ہو۔ خیر آپ بات کہئے پنڈت جی . . . چلم بجھ گئی۔ تو تم ہی کو پھر بھر کر لانی پڑے گی . . . جی پنڈت جی؟"

پنڈت جی کھسیانے سے ہو گئے تھے۔ مگر ہم لوگوں کا لحاظ۔ ایک بار پھر حوصلہ کرکے بولنے کی ٹھانی۔" ہماری ان شرارتوں کو ریل کا گارڈ بھی بریک میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ پائیدان پائیدان چلتا ہُوا ہماری گاڑی میں آن پہنچا۔ ہم نشانہ تاک رہے تھے

کہ یک بیک آ کر ہمیں پکڑ لیا"۔

چچا نے ذرا گردن اٹھا کر اور آنکھیں جھپکا جھپکا کر اپنے متاثر ہونے کا ثبوت دیا۔ "ہئی ہے!"

گارڈ نے ہم کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کیا۔ کہ تم پیدل مسافروں کو تکلیف پہنچا رہے ہو۔ میں نے مجبوراً یہ بہانہ بنایا کہ کچھ آم سڑ گئے تھے۔ اس لئے ہم انہیں پھینک رہے ہیں ہم نے خیال نہ کیا تھا۔ کہ کوئی مسافر بھی سڑک پر جا رہا ہے۔

چچا نے یک لخت ایسی بلند آواز میں ایک "واہ وا" کی جیسے کسی بوتل کا کاگ اچانک کھل گیا ہو "سبحان اللہ کیا بات پیدا کی آپ نے!"

کچھ دیر کو۔ جیسے پنڈت جی کی زبان بند ہو گئی حیرت کے عالم میں ہمارا منہ تکنے لگے۔ ہم سب کی یہ کیفیت کہ شرم سے پسینہ پسینہ ہو رہے ہیں۔ غصے کی لہریں اٹھتی ہیں اور ٹھنڈی پڑ پڑ جاتی ہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ان سے کہا۔ جس طرح ہو اس داستان کو ختم کیجئے۔ چنانچہ بھرائی

ہوئی سی آواز میں پھر داستان شروع کر دی۔ بولے "میں نے گارڈ کو اطمینان دلایا کہ اب ایسی حرکت نہ ہوگی۔ چنانچہ وہ ہم پر بگڑ بگڑا کر رخصت ہو گیا۔ اب . . ."

"چلا گیا؟ تو یوں کہئے رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔

بعض اوقات تو صاحب یہ لوگ ایسا پریشان کر دیتے ہیں کہ ناک میں دم آجاتا ہے۔ اب دیکھئے۔ ایک اپنا واقعہ عرض کرتا ہوں۔ سنہ۔ خدا تمہارا بھلا کرے سنہ نو کا ذکر ہوگا یا دس کا۔ یا گیارہ ہی ہو تو عجب نہیں۔ بہرحال کچھ ہی تھا وہ۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے۔ نہ نہ یاد آ گیا ہمیں۔ سنہ ۱۰ء ہی کی بات ہے۔ ان ہی دنوں بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کا انتقال ہوا تھا۔ ہم سہارن پور سے مراد آباد جا رہے تھے۔ گھر کے لوگ بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ بچوں میں بس یہ للو تھا گود میں۔ یا شاید ددو بھی۔ نہ ددو نہیں ہوا تھا پیدا۔ بہرحال۔ تو بات یہ تھی۔ کہ ہماری خوش دامن کچھ . . . غرضیکہ بعض عوارض تھے انہیں۔ خطوط کے ذریعے ہمیں معلوم ہو چکا تھا۔ کہ وہ علاج کروانے کے

لئے شاہ جہاں پور جانے والی ہیں۔ ہم نے انہیں خط میں لکھ دیا تھا۔ کہ ہم مراد آباد کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوں گے۔ اگر اس عرصہ میں آپ شاہ جہاں پور چلی جائیں۔ تو ایسا انتظام کرتی جائیے گا۔ کہ ہمیں اسٹیشن پر اس کی اطلاع مل جائے۔ اور اگر آپ رخصت ہو چکی ہوں تو ہم بجائے مراد آباد اترنے کے اسی گاڑی میں شاہجہاں پور روانہ ہو جائیں۔ لیجئے جناب ہمارے پہنچتے پہنچتے وہ شاہجہاں پور روانہ ہو گئیں۔ اسٹیشن پر ہمیں اس کی اطلاع ملی۔ رات کا وقت تھا۔ سردی کا موسم۔ ہم نے سوچا۔ کہ اب کون اُتر کر آگے کا ٹکٹ لے۔ شاہجہاں پور پہنچ کر مراد آباد سے وہاں تک کا کرایہ ادا کر دیں گے۔ وہاں پہنچے۔ تو ہماری شرافت ملاحظہ فرمایئے۔ کہ ریل والوں کو صاف صاف کہہ دیا۔ کہ بھائی لوگو۔ ہمارا ٹکٹ مراد آباد تک کا تھا۔ باقی تمہارا جو کچھ ہمارے ذمّے نکلتا ہو اب لے لو۔ لیجئے صاحب وہ تو اکڑ گئے۔ کہیں۔ کہ ہم تو دگنا کرایہ لیں گے۔ ہمارا قاعدہ یہی ہے۔ بہتیرا سمجھایا۔ لڑے

جھگڑے منّت خوشامد کی۔ مگر بے سود۔ مجبوراً دُگنا کرایہ ادا کر کے خلاصی ہوئی۔ تو میرا یہ بیان کرنے سے مطلب یہ کہ یہ ریل والے جب ستانے پر تُل جائیں۔ تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔"

چچا حقہ پینے لگے۔ محفل پر ایک ناگوار سا سکوت چھا گیا۔ پنڈت جی کی اب یہ کیفیت گویا کسی نشے سے دماغ سُن ہو گیا ہے۔ ہم سب کی عجیب حالت۔ داستان جاری رکھنے کو کہیں۔ تو قطع کلام کا ڈر۔ خاموش ہو رہیں۔ تو یہ شرمندگی کہ پنڈت جی کی بات ادھ بیچ میں رہ گئی۔ اتنے میں چچا چھکن نے کہنیاں اٹھا اٹھا کر انگڑائیاں اور جماہیاں لینی شروع کر دیں۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھی۔ کہ چچا اب زیادہ دیر نہ بیٹھیں گے۔ اور بات شاید جلد ختم ہو سکے۔ چنانچہ ملکے سے کہہ دیا۔ "جی پنڈت جی پھر؟"

چچا نے ایک نئی جماہی لے کر کہا۔ "ختم نہیں ہوئی ابھی بات؟ تو پھر کہہ ڈالئے جلدی سے۔ اب تو کچھ نیند آ چلی ہمیں۔ کیا وقت آ گیا ہو گا؟ سوا گیارہ۔ اُفوہ۔ دیکھئے

تو بات چیت میں دقت کیسی جلدی گنہ رہتا ہے۔ ہاں تو کیا رہ گیا باقی اب؟"

پنڈت جی کے لئے ایسی حالت میں یہ کہنے کے سوا چارہ نہ تھا" ایسی کونسی ضروری بات ہے۔ کہ اسے ختم ہی کیا جائے ۔ نیند آرہی ہے ۔ تو آپ اب آرام فرمائیے"

چچا چھکن نہ مانے ۔ بولے" نہ نہ بات ختم کر لیجئے آپ ایسی جلدی نہیں مجھے۔ وہ بات یہ ہے ۔ کہ جلد سو رہنے اور صبح جلد اٹھنے کا عادی ہوں ۔ تاہم کیا ہُوا۔ آپ شوق سے فرمایئے"۔

پنڈت جی بے چارے کھوئے کھوئے ایک مردہ تبسم سے پھر گویا ہوئے ۔ بات شروع تو تفریح کے لئے کی گئی تھی ۔ پر حالت یہ تھی ۔ کہ کوئی باہر سے آتا ۔ تو اسے قطعی طور سے یہ معلوم ہوتا ۔ کہ پنڈت سے کوئی بہت بڑا جرم ہو گیا ہے جس کے لئے یہ غریب چچا چھکن سے معافی مانگ رہا ہے۔

"گارڈ کے جانے کے بعد ہمیں فکر ہوئی ۔ کہ اول تو

چوری کا مال کھایا۔ اور پھر اس پر یہ شرارت کہ اس کی خبر گارڈ تک پہنچی۔ اب اگر کوئی جھگڑا اُٹھا۔ اور باقی آم اور کپڑا ہمارے پاس سے نکلا۔ تو خاصا چوری کا مقدمہ بن جائے گا۔ (چچا چھکن کی جمائی) چنانچہ یہ سوچا۔ کہ جو آم باقی ہیں۔ انہیں چپکے سے پھینک دیا جائے۔ تاکہ کوئی سراغ باقی نہ رہے۔ چنانچہ ہم نے آم اور وہ نئی دوہر جس میں وہ بندھے ہوئے تھے۔ لپیٹ کر چلتی گاڑی میں سے باہر پھینک دی (چچا چھکن کی جمائی جس کے آخیر پر کچھ اس قسم کا شور تھا جیسے منہ چڑھانے وقت نکلتا ہے) تھوڑی دیر بعد ہمارا سفر ختم ہو گیا۔ اور ہم مراد آباد اتر کر اپنے گھر پہنچے۔۔۔"

چچا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "بھئی ہمیں تو نیند آ گئی۔ پنڈت جی۔ قصہ تو بڑا دلچسپ تھا۔ مگر بقول آپ کے ایسی کونسی ضروری بات ہے۔ کہ اب اسے ختم ہی کیا جائے۔ میں تو معافی چاہتا ہوں۔ انہیں سنائیے آپ"۔

ذرا سی بات باقی رہ گئی تھی۔ ہم سب نے کہا۔

"چچا میاں۔ بس ذرا سی تو بات باقی ہے۔ اب سُن ہی لیجئے"۔
"نہ بھئی اب تو سوئیں گے ہی ہم"۔
"دو تین ہی تو فقرے ہیں"۔
"بس اب تم ہی سنتے رہو"۔
"ہم تو سُن چکے تھے۔ آپ ہی کو سنا رہے تھے پنڈت جی"۔
"آنکھیں مچی جا رہی ہیں"۔
"ہاں ہاں آرام فرمایئے آپ"۔
"ہاں بس اب لیٹوں گا۔ وہ ودّو۔ تم پان اور پانی ہمارے سرہانے رکھ دینا۔ اور للّو یہاں سے اُٹھ کر حقّہ بھی ہمارے پلنگ کے ساتھ رکھ آنا، صبح ضرورت ہو گی ہمیں، مگر دیکھنا چلم باہر الٹ لینا۔ اور للّو وہ دوا ہماری رکھنا نہ بھول جانا اور شاید یہ اُگال دان بھی تو ہمارے ہی کمرے کا ہے یہاں یہ بھی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔ سمجھ لیا نا؟"
"چچا میاں اتنی دیر میں تو بات ختم بھی ہو جاتی"۔
چچا اصرار سے کچھ چڑ گئے۔ بولے "ہوتی تو ہو جاتی!

پھر ہم کیا کریں۔ بات نہ ہوئی مذاق ہی ہو گیا"۔

مایوس ہو کر مجھے اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا۔ کہ پکار پکار کر کہوں! "چچا میاں وہ آم کی گٹھڑی اصل میں پنڈت جی ہی کی ملازمہ کی تھی۔ گھر جا کر بھید کھلا۔ اور پھر یہ دو سو اور آم پھینکنے پر پچھتائے"۔

"ہماری بلا سے"۔

یہ کہہ کر چچا زور سے دروازہ بند کر کے اندر چلے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اصرار سے وہ اور کھچ گئے ہیں ان کے جانے کے بعد کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ پہلی مرتبہ ہمیں احساس ہوا۔ کہ کلاک چل رہا ہے۔

# چچا چھکن نے تیمارداری کی

چچا چھکن دل میں بخوبی جانتے ہیں۔ کہ تیمارداری ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس کے لئے جس جفاکشی سکونِ خاطر اور صبر و استقلال کی ضرورت ہے۔ وہ انہیں ایسی چھو نہیں گیا۔ اسی وجہ سے عام طور پر اپنی تیمارداری کو عیادت کے درجے سے آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ لیکن طبیعت کے ہاتھوں ایسے ناچار ہیں۔ کہ ذرا سی بات میں تاڑ کھا جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک روز آ گا پیچھا سوچے بغیر تیمارداری کے میدان میں جوہر دکھانے پر آمادہ ہو گئے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چچی کے سلیقے میں انہیں ایسا

اپنے سگھڑاپے کی توہین نظر آتی رہتی ہے۔ پھر اگر کسی بات
میں چچی اپنی عرق ریزی اور ان کی فراغت کی طرف بھی اشارہ
کر دیں۔ تو چچا آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اور "دل ناتواں"
مقابلہ کئے بغیر باز نہیں رہ سکتا۔ خیر گھر کے دوسرے قصول
میں جو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ ان مقابلوں کا نتیجہ
سبق آموز ہو یا نہ ہو۔ چچا غیرت والے ہیں۔ تو آیندہ کسی
کی تیمارداری کا بیڑا تو اٹھائیں گے نہیں۔

بات یوں ہوئی۔ کہ پچھلے دنوں للّو غریب کو نکلا موتی
جھرہ۔ شب برات سے اگلے روز جو ہلہلا کر بخار چڑھا ہے
تو اکیس دن گذر گئے۔ ٹس سے مس نہ ہوا۔ گھر میں کام کرنے
والی لے دے کے ایک چچی۔ وہ غریب کیا کیا کریں؟ گھر
اُٹھائیں۔ ہنڈیا چولھا دیکھیں۔ بچّے سنبھالیں یا ہر وقت
بیمار کی پٹّی سے لگی بیٹھی رہیں؟ ادھر بیمار کے پاس آکر
بیٹھیں۔ ادھر ماما کی آواز آگئی "بیوی دال دے جائیں
کہ میں بین لیتی۔ نہیں کرکل رہ جائے گی"۔ باورچی خانے
میں پہنچیں۔ تو للو نے ٹھنکنا شروع کر دیا۔ کہ میں نو اماں

ہی کے ہاتھ سے پانی پیوں گا۔ کس کو نہالیں کس کی خبر لیں۔ دن اسی قواعد میں گزرتا۔ رات آنکھوں میں کٹتی۔ پھر ایک دن نہ دو دن۔ میعادی بخار۔ تین ہفتے کی محنت نے ادھ مؤا کر ڈالا۔ اکیسویں دن سے آس لگائے بیٹھی تھیں۔ کہ بخار ٹوٹ جائے گا۔ لیکن اکیسواں دن بھی آیا۔ اور صاف گزر گیا۔ ایک اَور ہفتہ پہاڑ کی طرح سر پر آ کھڑا ہوا۔ تیسرے پہر بیٹھی تو لئے سے للّو کے جھانواں کر رہی تھیں۔ کہ کہیں چچا نے امامی کے ہاتھ پان کی ڈبیا اندر بھیج دی۔ ساتھ ہی کہلا بھیجا "خوب اچھی طرح بھر دیں"۔ چچی فکرمند تو بیٹھی ہی تھیں۔ ادھر ہاتھ بھی رکا ہوا تھا۔ بگڑ کر بولیں "لے جا اٹھا کے پاندان۔ بھرتے رہیں گے آپ ہی"۔

پاندان کے جواب میں چچا خود آموجود ہوئے۔ "وہ پاندان بھیج دیا تم نے!"

چچی غصہ کڑوے گھونٹ کی طرح پی گئیں۔ صرف اتنا کہا "اور کیا بیمار کی چارپائی اٹھوا کر بھیجتی؟"

چچا کو اس کی شرح سمجھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ چچی کے تیور بے ڈھب تھے۔ للّو سے مخاطب ہو گئے "کیوں بے یار للّو! ارادی چین لکھنا ہے نا؟ بڑے ٹھاٹھ سے جھانواں کروا رہے ہو استاد۔ اب یہ کہو تم اُٹھتے کب ہو؟"

چچی سے نہ رہا گیا بولیں "جلدی اٹھ بیٹھ بیٹے۔ ابا فکر کے مارے دبلے ہوئے جا رہے ہیں۔"

اب اتنے کھلے وار پر چپ رہنا بھلا چچا کے لئے کیسے ممکن تھا۔ بولے "یعنی تم سمجھتی ہو۔ تمہارے سوا کسی کو بچے کی فکر ہی نہیں ہے؟"

چچی رو کھی ہنسی ہنس پڑیں "یہ تو وہی مثل ہوئی۔ کہ چور کی داڑھی میں تنکا۔"

چچا کے لئے بات کھول کر کرنے کے سوا چارہ نہ رہا "بڑا تیر مارا۔ کہ دو روز تیمارداری کر لی۔ سمجھ بیٹھیں۔ کہ ہمچو من دیگرے نیست۔ جناب نے تو ایک بچے کی تیمارداری کی ہے۔ میں بیسیوں جوانوں کی تیمارداری کر چکا ہوں۔ اور اب بھی میں نے اگر زیادہ دخل نہیں دیا۔ او دل مار

کے چپکا بیٹھا رہا۔ تو کس کے خیال سے؟ تمہارے۔ کہ بھئی ماں ہے۔ اسے بچے کی ممتا ہے۔ جو جی چاہے کر لینے دو۔ ورنہ مجھے خود کب گوارا تھا۔ کہ بیمار بچے کو تمہارے ہاتھ میں چھوڑ دوں"۔

چچی سر پھیرتے ہوئے بولیں "کبھی اتنی توفیق تو ہوئی نہیں۔ کہ گھڑی دو گھڑی آ کر بیمار کے پاس بیٹھ جائیں۔ آ جاتے ہیں صبح شام ناک پر دیا جلا کر۔ کہ اتر گیا ہوگا بخار۔ کیا بات اب تک اترا کیوں نہیں۔ تیز ہے؟ ادہو! . . . یہ تیمارداری کریں گے"۔

چچا چھکن دشنام سن سکتے ہیں۔ لیکن ایسا طعنہ جس میں ان کی قابلیت کے کسی پہلو کی طرف اشارہ ہو۔ اور پھر چچی کی زبان سے۔ ان کی برداشت سے باہر ہے۔ نہیں غالباً دل ہی دل میں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ گویا اس میں مضمر ہے۔ کہ چچی نے ان کی بیوی بن کر ان پر بڑا احسان دھرا ہے۔ اور بیوی کا احسان لینا ان کی مردانگی کسی صورت گوارا نہیں کر سکتی۔ بغیر سوچے

سمجھے بولے" جایئے۔ آپ باورچی خانے میں تشریف لے جایئے۔ چولھا پھونکئے۔ میں آپ کرلوں گا تیمارداری"۔

چچی ایسے دعووں کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں ناک چڑھا کر بولیں" کیا کروں۔ پتھر تلے ہاتھ دبا ہے ڈاکٹر نے کہہ رکھا ہے۔ ایک سے زیادہ تیماردار بچے کے پاس نہ رہے۔ گھر میں شور و غل نہ ہو۔۔ ورنہ مجھے تو انکار نہ تھا کہہ دیتی۔ یہ ارمان بھی شوق سے نکال دیکھو"۔

نہ معلوم چچا ایسے موقعوں پر جان بوجھ کر انجان بن جاتے ہیں۔ یا اسی قسم کے گذشتہ دعووں کے عواقب انہیں یاد نہیں رہتے۔ بولے" تم ایک تیماردار آدمی ہیں ایک سے زیادہ ہوگیا؟ وہ کیوں؟ اور یہ شور و غل کیسا؟ تم تو جیسے چپ شاہ کا روزہ رکھے بیٹھی رہتی ہو؟

چچی جل کر بولیں" چپ شاہ کا روزہ نہیں رکھتی۔ تو بات بات پر امامی اور مودے اور بندو کو پکار کر گھر بھی سر پر نہیں اٹھاتی"۔

چچا بگڑ کر بولے" بہت اچھا۔ جایئے۔ مودے اور

امامی اور بندو کو بھی باورچی خانے میں گھٹنے سے لگا کر بٹھا رکھئے۔ میں ان کے بغیر بھی جناب کو دکھادوں گا کیونکر کرتے ہیں تیمارداری"۔

چچا کو کمزور حریف سمجھ کر چچی عام طور سے ایسی بات گول کر جایا کرتی ہیں۔ لیکن اس وقت انہیں بھی نہ معلوم کیا ہوا۔ جیسی بیٹھی تھیں۔ ویسی ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور چھانوے کا تولیا چچا کے ہاتھ میں پکڑا سیدھی باورچی خانے کو چل دیں۔

ان کے یوں اچانک اٹھ کھڑے ہونے کی امید چچا کو بھی نہ تھی۔ حیران سے رہ گئے۔ ایک منٹ تو چپ چاپ تولئے کو دیکھتے رہے۔ آخر ذمہ واریوں سے اور مجبوریوں کے احساس سے کھسیانی ہنسی ہنس پڑے۔ للو سے کہنے لگے۔ "دیکھتا ہے ان کی باتیں؟ سمجھتی ہیں۔ بس انہیں ہی آتی ہے تیمارداری۔ اور سب تو اپاہج ہیں"۔

اماں کے چلے جانے سے للو کچھ کبیدہ خاطر ہو گیا تھا۔ کروٹ لے کر پڑ رہا تھا۔ غالباً تکلفاً چچا نے پوچھ لیا۔ "کیوں

بھئی جھانواں کرتے رہیں؟"

للو نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ سر ہلا کر ہاں کر دی۔ چنانچہ چچا کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا۔ کہ جھانواں کریں اور بغیر کسی کی امداد کے کریں۔ بولے "ہم آپ کریں گے اپنے بیٹے کے جھانواں۔" ذرا سے تامل کے بعد آپ پائنتی بیٹھ گئے۔ بولے "لو بھئی ہم تو کرتے ہیں جھانواں۔ اور تم کرو ہم سے باتیں"۔

جھانویں کے لئے تولیا بچھا کر سب پہلوؤں پر سے ایسے تکلف و اہتمام سے تہ کیا گیا۔ جیسے چچا جھانویں کے لئے گدی نہیں بنا رہے۔ بیمار کے دل بہلاؤ کے لئے تولیے کی ناؤ تصنیف فرما رہے ہیں۔ اس دوران میں للو سے برابر مخاطب رہے۔ "یہ چپ سادھنے کی شرط نہیں ہے۔ یوں تمہارا دل گھبرا جائے گا۔ باتیں کرنی ہوں گی ہم سے۔ ہاں، اچھا یہ بتاؤ۔ اچھے ہو کر تم کھاؤ گے کیا کیا؟"

اکیس دن کا بیمار۔ بھلا باتیں کیا کرے۔ کروٹ

لئے چپکا پڑا رہا۔ تولیا تہ کر چکنے کے بعد چچا کے چہرے پر فخر و اطمینان کی ایک مسکراہٹ کھیلنے لگی۔" اب بنی نہ گدی جھانویں کی۔ اسے کہتے ہیں گدی۔ کبھی دیکھی بھی نہ ہو گی بیگم صاحبہ نے"۔

چچا نے جھانواں شروع ایسے زور و شور سے کیا گویا جھانواں نہیں کر رہے۔ پاؤں پر پالش کر رہے ہیں۔ باتیں مجبوراً بند کر دی تھیں۔ کیونکہ ہاتھ کی حرکت کے باعث باتیں گیت کی تانیں سی بن کر حلق سے نکلتی تھیں۔ بار بار گردن بڑھا کر صحن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کہ شاید کسی سے نظریں چار ہو جائیں۔ اور وہ اس کارِ نمایاں کی خبر چچی تک پہنچا دے۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ بات نہ ہوتی تھی۔ مگر محض چچی کے سنانے کو باآوازِ بلند کہے بھی جا رہے تھے۔" اب مزہ آیا ہو گا جھانویں کا . . . بڑی محنت کا کام ہے . . . ایک طرح کا فن سمجھنا چاہیئے"۔

لیکن پانچ ہی منٹ بعد صورتِ حالات میں تبدیلی

رونما ہوئی۔ پہنچے اور کہنیاں دکھنے لگیں۔ بازو ڈھیلے پڑ
گئے۔ ہاتھ رہ گئے۔ دل اُکتا گیا۔ اُٹھنے کی فکر ہونے لگی۔
مگر اب اٹھیں کیونکر؟ خود اُٹھتے ہوئے ندامت ہوتی
تھی۔ لڑکا بس کرنے کو کہتا نہیں تھا۔ نہ امید تھی کہ
کہے گا۔ وہ آنکھیں بند کئے ایسا خاموش پڑا تھا۔ گویا اُسے
خبر ہی نہیں کہ چچا پر کیا گذر رہی ہے۔ آخر کچھ دیر بعد
تنگ آ کے چچا نے ہاتھ روکنا اور اس سے پوچھنا شروع
کیا۔ "کیوں بھئی پیاس تو نہیں لگی؟ پانی لاؤں؟ انار کے
دانے نکال دوں؟ . . . ارے ہاں للّو۔ وہ جو تو نے
پودا لگایا تھا کیاری میں۔ اس میں پھول آ گئے۔ لاکر
دکھاؤں؟" مگر للّو نے کسی ایسی چیز کی فرمائش نہ کی۔
جسے لانے کے لئے چچا کو اُٹھنے کا موقع مل سکتا۔ اسی
طرح گم سم چپکا پڑا رہا۔

دو ایک دفعہ چچا نے ایسا بے خلل انداز اختیار
کر کے اُٹھنے کی کوشش کی۔ گویا ان کی رائے میں للّو سو
گیا ہے۔ مگر ان کے ہلتے ہی للّو کراہنے لگا۔ یا آنکھیں

کھول دیں۔ چنانچہ چچا کو طوعاً و کرہاً پھر بیٹھ جانا پڑا + پاؤں سو گئے تھے۔ ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ کبھی بیٹھنے کا انداز بدلتے۔ کبھی جھانواں روک کر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کا بازو دبانے لگتے۔ جھانواں برائے نام ہو رہا تھا مریض بھی بے چین تھا۔ چچا گھبرائی گھبرائی نظروں سے اِدھر اُدھر تک رہے تھے۔ کہ کسی طرح اُٹھنے کا کوئی بہانہ ملے۔ مگر کسی طرح مشکل آسان نہ ہوتی تھی۔ آخر دل کڑا کر کے بولے:۔

"بس بھئی اب زیادہ جھانواں نہیں کرتے ضعف ہو جاتا ہے"۔ یہ نہ معلوم ہؤا کہ مریض کو یا جھانواں کرنے والے کو ٭

یہ کہہ چچا فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور آرام کرسی پر دراز ہو گئے + تیمارداری کا جوش کچھ سرد سا پڑ گیا تھا بڑی دیر تک منہ بنا بنا کر اپنے ہاتھ دباتے اور انگلیاں چٹخاتے رہے + ٹانگیں پھیلا پھیلا کر تھکن اتاری + حواس بجا ہوئے۔ تو للو کی طرف توجہ کی" سو گئے للو! للو بھیا!

"اے للّو! او للّو! نیند آگئی کیا؟ اچھا سو رہو۔" باہر چچی نے آواز سن لی۔ چھٹن کے ہاتھ کہلا کر بھیجا۔ "سونے نہ دینا۔ دوا کا وقت ہے۔ سرہانے چھوٹی میز پر دوا کی شیشی رکھی ہے۔ ایک خوراک دے دو۔"

چچا دوا دینے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ شیشی ہاتھ میں لے کر لیبل پڑھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ ڈاڑھی کھجلائی۔ پیٹ سہلایا۔ بیتاب تھے۔ کہ کسی کو امداد کے لئے پکاریں۔ لیکن آج کے دن کسی کی امداد لینا غیرت کو گوارا نہ تھا۔ مجبوراً خود ہی دوا دینے پر آمادہ ہوئے۔ شیشی رکھ دوا نکالنے کے لئے پیالی لائے۔ کاگ نکالا۔ پہلے تو شیشی کو دانتوں میں پکڑ کر کاگ کو پیالے میں انڈیلنے کی کوشش فرمائی۔ اس کے بعد لاحول کہہ کر کاگ میز پر رکھ دیا۔ اور شیشی سے دوا انڈیلنی شروع کی۔ بوند بوند بھر نکالتے اور آنکھیں چندھیا چندھیا کر خوراک کا نشان دیکھ لیتے۔ ذرا سی دوا نکالنی باقی تھی۔ کہ شیشی ذرا زیادہ اُلٹ گئی۔ ڈیڑھ خوراک نکل آئی۔

چچا نے پہلے تو پیالی ٹیڑھی کی۔ کہ زائد خوراک گرا دیں۔ پھر خیال آیا۔ کہیں ضرورت سے زیادہ دوا گرکر خوراک کی مقدار کم نہ ہو جائے۔ چنانچہ ارادہ کیا کہ زائد دوا شیشی ہی میں ڈال کر اطمینان کر لیں ٭

پیالی سے دوا شیشی میں اُنڈیلی۔ آپ جانئے پیالی کے چونچ تو ہوتی نہیں۔ کہ دوا سیدھی شیشی میں چلی جاتی شیشی کے باہر بہہ کر نیچے گر پڑی ٭ چچا نے ذرا دیر ہاتھ روک کر سوچا۔ اب کیا کریں! اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا۔ کہ پیالی میں جو دوا باقی رہ گئی تھی۔ وہ بھی شیشی ہی میں انڈیل دیں۔ اور ازسرِ نو ایک پوری خوراک نکالیں ٭ چنانچہ یک لخت انڈیلی دوا۔ شیشی میں تو ذرا سی گئی۔ باقی سب ہاتھ پر سے بہتی ہوئی فرش پر گر پڑی ٭

چھٹن کے ہاتھ چچی نے انار کے دانے نکال کر بھیجے تھے وہ غریب کھڑا دوا نکالنے کا یہ تماشا دیکھ رہا تھا اسے آگئی ہنسی ٭ ایسے موقع پر کوئی ہنس پڑے تو چچا کو

آگ لگ جاتی ہے۔ سر پھیر کر لال پیلی آنکھوں سے اسے گھورا۔ "بدتمیز کہیں کا۔ ہنسا کاہے پر؟ اور یہ کیا موقع تھا ہنسی کا؟ پیٹ پیٹ کر اتو کر دوں گا۔" غرض غریب کو ڈانٹ ڈانٹ کر ونکھا بنا دیا۔

ہاتھ پونچھ پانچھ چچا نے شیشی کو جو دیکھا۔ تو دوا آدھے نشان تک تھی۔ آدھی اس ادلا بدلی میں ضائع ہو چکی تھی۔ اب کیا کریں؟ آدھی خوراک سے آدھی خوراک تک دوا نکالنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ غور و خوض کے بعد طے کیا۔ کہ بقیہ آدھی خوراک بھی ضائع کر دی جائے۔ اور اس سے اگلی پوری خوراک نکالی جائے۔ چونکہ باقی خوراک مریض کو نہ دینی تھی۔ بلکہ ضائع کرنی تھی۔ اس لئے اسے احتیاط سے نکالنے کی ضرورت چچا کو نہ سوجھی۔ دروازے میں جا شیشی ذرا بے فکری سے دروازے میں الٹا دی۔

اب جو شیشی آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھتے ہیں۔ تو دوا پھر آدھے ہی نشان تک مگر اگلی سے اگلی خوراک

کے، چچا جھنجھلا اُٹھے۔ بے ساختہ چند ناگفتہ بہ کلمات ان کی زبان سے نکل گئے۔ مگر قہرِ درویش بر جانِ درویش کر کیا سکتے تھے؟ امامی بندو کا تصور تو تھا نہیں۔ کہ غل مچا مچا کر دل کی بھڑاس نکال لیتے۔ اگلی آدھی خوراک ضائع کرنے کے عمل میں مصروف ہو گئے۔ قصہ مختصر کوئی آدھ گھنٹہ اور پانچ خوراکیں ضائع کرنے کے بعد چچا خاطر خواہ طور پر دوا نکالنے میں کامیاب ہوئے۔

للّو کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اسے جگایا۔ وہ ٹھنکتا ہوا جاگا۔ بچے کے ٹھنکنے اور رونے سے چچا کی تیمارداری پر حرف آتا تھا۔ دبی زبان میں اسے چمکارا۔ اور اس سے طرح طرح کے جھوٹے وعدے کئے۔ "ایک تو جناب من ہم نے تمہارے لئے ڈور کی پوری ریل منگوائی ہے۔ اور جناب دوسرے گلشن سے کہا ہے۔ کہ ایک درجن رنگ برنگ کی کنکیاں بنا کر لائے۔ بس ادھر تم اچھے ہوئے۔ اور ادھر پیچ لڑنے کا سامان ہوا"۔

چچا چارپائی پر چڑھے۔ سہارا دے کر للو کو اٹھایا

دوا دینے لگے۔ تو خیال آیا۔ کہ کلّی کے لئے پانی تو لائے ہی نہیں۔ اسے پھر لٹا بھاگے بھاگے پانی لینے چلے گئے پانی کی پیالی میز پر رکھ کر پھر چارپائی پر چڑھے۔ للّو کو اٹھایا سمجھا بجھا کر بہزار دقّت دوا پینے پر آمادہ کیا، اب جناب نے کیا تماشا کیا۔ کہ پانی کی پیالی تو اس کے منہ سے لگا دی اور کلّی کے لئے دوا کی پیالی ہاتھ میں تھام بیٹھ رہے جب اس نے خود ہی ٹھنک کر بتایا۔ کہ یہ تو پانی ہے۔ تو آپ کو اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ ندامت تو کیا ہوتی۔ اوہو کہہ کر پیالیاں بدل لیں۔ اور دوا کی پیالی للّو کو دی ؛

خالی پیالی اس کے ہاتھ سے لے کر کلّی کے لئے پانی دیا۔ تو اب اگالدان کا خیال آیا۔ گھبرا کر اُگال دان لینے کو لپکے۔ بچے کا سر دھڑ سے تکئے پر آ گرا۔ ادھر دوا سے اس کا منہ کڑوا اُدھر لگا سر کو دھچکا۔ زور زور سے رونے لگا۔ آپ کبھی اس کے آگے گلاس کرتے ہیں۔ کبھی اُگال دان۔ کبھی انار کے دانے۔ مگر بیمار کی ضد۔ وہ

کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ اماں اماں کہہ کر روئے جا رہا ہے۔ چچا گھبرا گھبرا کر کبھی للو کو دیکھتے ہیں۔ کبھی دروازے کو کہ کہیں چچی نہ آ رہی ہوں بچے کو کبھی لپٹاتے ہیں۔ کبھی منتیں خوشامدیں کرتے ہیں۔ مگر اس پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ مجبوراً چچی کی سامعہ نوازی کو بلند آواز میں کہنا شروع کیا "اب ہم نے تو دواؤں میں کڑواہٹ ملا نہیں دی۔ ایسی ہی ہوتی ہیں ان ڈاکٹروں کی دوائیں۔ ہمارا کوئی قصور ہو تو ہم ذمہ دار۔ یوں اماں ہی کے بلانے کو جی چاہ رہا ہو تو تم جانو"۔

چچی باورچی خانے سے فارغ ہو کر چچا کے پانوں کی ڈبیا بھر رہی تھیں۔ وہیں سے بولیں "آئی بچے آئی"۔ اتنے چچی آئیں۔ للو نے رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا۔ ہچکی بندھ گئی تھی۔ چچا کے ہاتھ پاؤں الگ پھول گئے تھے اب ان سے تسلی بھی نہ دی جاتی تھی۔ الگ کھڑے سراسیمہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ منہ تک بات آتی تھی

مگر نکل نہ سکتی تھی۔ دلاسا دینے کو ہاتھ اُٹھانا چاہتے تھے مگر نہ اُٹھتا تھا۔ چچی آئیں۔ تو ان کے حواس بجا ہوئے۔ بولے "آپ ہی آپ رونے لگا۔ بس دوا دی تھی"۔

چچی نے پان میز پر رکھ دیئے۔ "اور میرا چاند میرا لال"! کہتی ہوئی لپک کر سرہانے بیٹھ گئیں۔ بچے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اور سہلانے لگیں۔ بچے کو ذرا سکون ہوا۔ تو چچا پان کی طرف متوجہ ہوئے۔ پان کھاتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگے۔ "رٹ ہی ماں کی لگ جائے۔ تو تیماردار غریب کیا کرے"۔

چچی نے للّو کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا تو ٹھنڈا ٹھنڈا تھا ہاتھ دیکھے تو وہ بھی ٹھنڈے! بولیں "اے ہے۔ اسے تو ضعف کا دورہ پڑ گیا۔ پنڈا ٹھنڈا پڑا جا رہا ہے۔ رنگت بھی تو پیلی پڑ گئی ہے۔ ارے کوئی دودھ لاؤ دودھ۔ پیچھے چولھے پر رکھا ہے۔ بالائی ہٹا کر لانا"۔

تیمارداری سے ابھی چچا کا باضابطہ چھٹکارا تو ہوا نہ تھا۔ پیالی اُٹھا خود دودھ لینے روانہ ہو گئے۔ باورچی خانے

میں ماما آٹا گوندھ رہی تھی۔ دودھ نکالنے کو اٹھنے لگی۔ چچا کے منہ میں ننھی پیک "اوں ہوں اوں ہوں" کر کے اسے روک دیا۔ لڑکے بڑھنے لگے "اوں ہوں اوں ہوں" کر کے انہیں بھی روک دیا۔ خود دیگچی اٹھا دودھ انڈیلنے لگے۔ دودھ جوش پر آکر ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس پر آ گئی تھی بالائی۔ چچی نے کہا تھا بالائی اتار کر دودھ لانا۔ بالائی ہٹانے کو آپ رکھ کر ایک پھونک جو مارتے ہیں۔ تو پان کی ساری پیک دیگچی میں! دودھ کی اچھی خاصی چائے بن گئی۔

اب چچا کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ کبھی دیگچی کو دیکھیں۔ کبھی کھوئے کھوئے ادھر اُدھر دیکھیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا قصور کس کا ہے! ایک مرتبہ دیگچی نیچے رکھ دی۔ پھر اٹھائی۔ دودھ کو غور سے دیکھا۔ پھر نیچے رکھ دی۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیمار کے کمرے کی طرف چلے۔ پھر باورچی خانے میں دیگچی کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ اور ٹھوڑی کھجانے لگے۔ آخر سب کچھ چھوڑ چھاڑ

باہر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور اندر سے چٹخنی لگالی . . . ایک منٹ بعد باہر نکلے اور دودھ کی دیگچی اُٹھا پھر اندر گھس گئے۔

اس واقعے سے گھر میں جو تکدّر پیدا ہُوا تھا۔ وہ للو کی صحت یابی سے پہلے رفع نہ ہو سکا۔

---

# چچا چھکّن نے ایک خط لکھا

وثوق سے یہ کہنا بڑا مشکل ہے۔ کہ چچا چھکن جب کسی کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ تو اس وقت ان کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے! خودنمائی کے شوق سے ناچار ہوتے ہیں۔ یا محض دستگیری خلق کا جذبہ دامنگیر ہوتا ہے۔ ذرا دیر کو مان لیا۔ کہ دونوں ہی باتیں ہوتی ہیں۔ خودنمائی کا شوق بھی اور دستگیری خلق کا خیال بھی۔ تو میں کہتا ہوں۔ ایک بار یہ ہونا ممکن ہے۔ دو بار ہونا ممکن ہے ایک دو بار نہ سہی دس بیس بار سہی۔ پر آخر دنیا میں تجربہ بھی تو کوئی شے ہے۔ کبھی تو خیال آئے۔ کہ اے شخص!

بیٹھے بٹھائے تجھے جو ہلہا اٹھا کرتا ہے۔ تو تو نے آج تک کوئی کام سلیقے سے نمٹایا بھی؟ کہیں حاصل بھی ہوئی سرخروئی؟ کسی نے داد بھی دی تیری کاردانی کی۔ چارہ گری کا دعویٰ وہ کرے۔ جسے اپنی تجربہ کاری پر تکیہ ہو۔ اور جو یہ نہیں۔ تو کیوں ایسی بات کرے۔ جس سے کالی ہانڈی سر پر رکھی جائے۔

اب آج ہی کا واقعہ ہے۔ کہ چچی کو ایک دعوت نامے کا جواب لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ اتفاق سے ان کا ہاتھ تھا رکا ہوا۔ چچا چھکن حسب معمول فارغ بیٹھے تھے۔ جواب مختصر سا لکھنا تھا۔ کام بھی جلدی کا تھا۔ پھر کیا امر انہیں اپنی خدمات پیش کرنے میں مانع ہو سکتا تھا۔ چنانچہ لکھا آپ نے جواب۔ اس کے لئے کیا کچھ اہتمام ہوا۔ گھر میں کیسا ہلڑ مچا۔ اور پھر کیا نتیجہ نکلا اس کی داستان سننے سے تعلق رکھتی ہے۔

بات یوں ہوئی۔ کہ صبح کے وقت چچی دالان میں چارپائی پر بیٹھی۔ بچوں کو چائے پلا رہی تھیں۔ چچا چائے

سے فارغ ہو کر صحن میں کرسی پر اکڑوں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ایک گائے خریدنے کی ضرورت اور اس کے متوقع فوائد و نقصانات کے انفرادی و اجتماعی نتائج و عواقب کے متعلق چچی کو معلومات بخشی جا رہی تھیں۔ اتنے میں باہر دروازے پر کسی نے آواز دی بندو بھاگتا ہوا گیا۔ اور ایک خط لے کر واپس آیا۔ چچی پرچ سے چھٹن کو چائے پلا رہی تھیں۔ خط لا کر ان کے قریب رکھ دیا۔

اتنے پرچ کی چائے ختم ہو۔ اور چچی خط اٹھائیں چچا نے دس مرتبہ پوچھ ڈالا "کس کا خط ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس نے بھیجا ہے؟ کیا بات ہے؟" چچی چڑ گئیں "توبہ ہے! کھولنے پائی نہیں۔ اور سوالات کا تانتا باندھ دیا۔ مجھے غیب کا علم تو آتا نہیں۔ کہ دیکھے بغیر بتا دوں کس کا خط ہے"۔

چچا کچھ خفیف سے ہو گئے۔ "بھلا صاحب خطا ہوئی کہ پوچھا، ہماری بلا سے۔ کسی کا ہو"۔ یہ کہہ کر بے نیازی

سے سر موڑ جلد جلد حقّے کے کش لینے لگے ۔

بندو نے کہا۔ "بیگم صاحب آدمی جواب کے انتظار میں کھڑا ہے۔" یہ سن کر چچا سے نہ بیٹھا گیا۔ چار پانچ کش لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کرتے میں ہاتھ ڈال پیٹ کھجاتے رہے۔ پھر بے تکلفی کے انداز میں ٹہلتے ہوئے باہر نکل گئے۔

چند منٹ بعد واپس آئے۔ کچھ دیر بے ترتیبی سے صحن میں ٹہلے منتظر تھے۔ کہ شاید چچی مخاطب کریں۔ آخر نہ رہا گیا۔ تو خود ہی پوچھا۔ "کیا لکھا ہے منصرم صاحب کی بیوی نے؟"

چچی نے چائے کی پرچ چھوٹن کے منہ سے لگاتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ "رات کھانے پر بلایا ہے۔"

چچا کا اضطراب زائل رخصت ہوگیا۔ "کیا بات ہے ۔ کوئی تقریب؟"

چچی نے کسی قدر سرسری انداز میں کہا۔ "بات کیا ہوتی۔ میر منشی صاحب کی بیوی مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔

انہیں اور مجھے دونوں کو کھانے پر بلا لیا ہے"۔

شاید مزید اطمینان حاصل کرنے کو چچا بولے۔" تو گویا زنانہ ضیافت ہے"! پھر غالباً خیال آیا۔ کہ بیوی کا کہیں مدعو کیا جانا ایک طرح میاں ہی کی ہردل عزیزی اور قدر و وقعت کا اعتراف ہے۔ چنانچہ اس جذبے کے ماتحت منصرم صاحب کی بیوی کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔" بہت معقول بیوی ہیں۔ ایسی ملنسار بیویاں کہاں نظر آتی ہیں آج کل۔ ضرور جاؤ ضیافت میں۔ بلکہ کوئی موقع ہو۔ تو انہیں بھی اپنے ہاں مدعو کرو"۔ ساتھ ہی ایک مشورہ بھی فیصلے کی صورت میں پیش کیا۔" بچے تو جائیں ہی گے ساتھ"۔

چچی نے کچھ بگڑ کر آہستہ سے کہا۔"ہمسایوں کو بھی نہ لیتی جاؤں"۔

چچا کو یہ جواب ناگوار نہ گذرا۔ ایک تو چچی بولی آہستہ سے تھیں۔ دوسرے کچھ زیادہ عام فہم بات نہ تھی۔ بہرحال پیٹ سہلاتے ہوئے مڑنے لگے۔ پھر رک گئے۔

کہا۔" ان کا ملازم جواب کا تقاضا کر رہا تھا"۔

چچی نے جواب میں چھٹن کو مخاطب کیا۔" کم بخت خدا کے لئے کہیں ختم بھی کر چک چاۓ۔ کیسل کئے جا رہا ہے۔ کس وقت سے پرچ پیالی لئے بیٹھی ہوں۔ نہ خود پینی نصیب ہوئی ہے۔ نہ ابھی نوکروں کو ملی ہے۔ ادھر چاۓ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ اُدھر باہر سے جواب کا تقاضا چلا آ رہا ہے"۔

آپ جانئے۔ ایسا موقع اور چچا اپنی خدمات پیش کرنے سے رُک جائیں۔ بولے" ہم لکھ دیں جواب"؟

چچی بولیں" نہیں آپ معاف رکھئے۔ فارغ ہو کر میں آپ ہی لکھ لوں گی"۔

روکے جانے کا باعث چچا کیونکر پوچھیں۔ بولے "کیا معنی۔ ہم خط لکھنا نہیں جانتے؟"

چچی نے چپ ہی ہو رہنا مناسب سمجھا۔ چچا کی کچھ تسکین نہ ہوئی۔

"اب کوئی فارغ خطی تو لکھنی نہیں۔ دعوت منظور

کرنے ہی کا خط لکھنا ہے نا۔ تو اس کا لکھنا ایسی کون سی جوئے شیر لانا ہے"۔

اتنے میں چھٹن نے جو جلدی سے چائے کا گھونٹ بھرا۔ اسے اچھو آ گیا۔ چائے کی کلی چچی کے کپڑوں پر پڑی وہ انڈیل رہی تھیں پرچ میں چائے۔ ان کا ہاتھ ہل گیا ساری کی ساری چائے کپڑوں پر آن پڑی۔ چچی "ہائے نامراد!" کہتی ہوئی تولئے سے کپڑے پونچھنے لگیں۔ اُدھر باہر سے آواز آئی۔ "کیوں صاحب ملے گا جواب؟" چچی نے گھبرا کر چچا سے کہہ دیا۔ "اچھا پھر اب تم ہی یہ لکھ دو کہ آ جاؤں گی"۔

اب کیا تھا۔ چچا کو منہ مانگی مراد ملی۔ خط و کتابت کے متعلق ضروری سامان فراہم کئے جانے کے احکام صادر ہونے لگے۔ "بندو میرا بھائی ذرا لانا تو خط لکھنے کا سامان جھپاک سے۔ کیا کیا لائے گا بھلا؟ قلم دوات اور کاغذ۔ شاباش۔ مگر کون سے کاغذ؟ آسمانی رنگ کے بڑھیا۔ رول دار۔ وہ جن کی کاپی سی ہے۔ ہاں ذرا دکھانا

تو اپنی چال۔ اور سنیو . . . چلا گیا! لفافہ بھی تو چاہئے ہوگا ارے بھئی کوئی لفافہ بھی تو لاؤ۔ تو جا کر لائیو مودے پر نیلے ہی رنگ کا ہو لفافہ۔ صندوقچے میں رکھے ہیں۔ لکڑی کے صندوقچے میں۔ الماری میں ہوگا صندوقچہ۔ ہری الماری میں۔ سن لیا نا؟ ذرا پھرتی سے"۔

یہ تو چچا کی عادت ہی نہ ٹھیری۔ کہ ایک مرتبہ یاد کر کے کہہ دیں۔ کیا کیا چیز چاہئے ہے۔ اِدھر مودا گیا۔ اُدھر جاذب یاد آگیا" ارے ہاں اور جاذب بھی تو لانا ہے بھئی جاذب۔ جاذب۔ کوئی نہیں سنتا۔ یہ امامی کہاں گیا؟ او امامی۔ ابے او امامی۔ دیکھیں اس بدمعاش کی حرکتیں بس کام نکلنے کی دیر ہے اور یہ غائب۔ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ ذرا تم چلے جاتے میاں للو۔ وہ جو ہری کاپی ہے نسخوں کی۔ وہ جس میں ہم نسخے نہیں لکھا کرتے عجب کوڑھ مغز ہو۔ بھئی کیمیا کے نسخے۔ لاحول ولا۔ میاں کاپی۔ ہری کاپی نسخوں والی۔ خیر اب تم نے دیکھی ہے یا نہیں۔ وہ ہمارے تکئے کے نیچے رکھی ہے۔ اس میں

ایک جاذب ہے۔ وہ نکال لاؤ۔ اور دیکھنا۔ اماں سنو۔ ارے بھئی للو! اے میاں للو! او للو کے بچے، عجب حالت ہے ان لوگوں کی۔ بس ایسے گھبرا جاتے ہیں۔ جیسے ریل ہی تو پکڑنی ہے۔ دو دو تم جا کر کہو جاذب نہ لائیں کاپی ہی لے آئیں۔ آخر خط بھی تو کسی چیز پر رکھ کر لکھا جائے گا۔ ہاتھ پر رکھ کر تو میں لکھنے سے رہا۔ اور سننا میری بات۔ وہ کہیں ہمارا چشمہ بھی رکھا ہو گا۔ وہ بھی ڈھونڈتے لانا۔"

لیجئے صاحب ایک دو منٹ میں گھر کا گھر مصروف ہو گیا۔ ایک کو کوئی چیز مل گئی۔ دوسرا خالی ہاتھ چلا آ رہا ہے کہ فلاں چیز نہیں ملتی۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں چیز مقفل ہے۔ کنجیوں کا گچھا کہاں ہے۔ گچھا ڈھونڈا جا رہا ہے۔ چچا بگڑ رہے ہیں۔ مونچھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔

"آنکھیں ہوں تو چیز سجھائی دے۔ اور پھر یہ بھی تو نہیں۔ کہ ہم یہاں کھڑے ہیں۔ ہم سے آ کر کہیں۔ کہ

صاحب فلاں چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں ہے۔ کہاں ہوگی سراغ رسان کے بچے خود تلاش کر کے رہیں گے۔ پوچھنے میں تو ان کی سبکی ہوتی ہے۔ آن پر حرف آتا ہے۔ پھر اب کیوں آئے ہو؟ ڈھونڈ و خود جا کر۔ اپنی جگہ پر چیز نہیں۔ تو تم ہی بدمعاشوں نے کہیں کی ہوگی غائب"۔

خدا خدا کر کے تمام چیزیں جمع ہوئیں۔ چچا نے چشمہ لگایا۔ کرسی پر براجمان ہوئے۔ لڑکے چیزیں لئے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ کاغذ سنبھالا۔ کاپی نیچے رکھی۔ قلم ہاتھ میں لیا۔ اب دیکھتے ہیں۔ تو اس کا نب ندارد "ہیں اور نب کہاں ہے؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ بلے اندھے اس سے لکھوں گا خط؟ ابے اس سے لکھنا ہوتا۔ تو میں اپنی انگلی سے نہ لکھ لیتا؟ تجھے قلم لانے کو کیوں کہتا؟ مگر یہ اتارا کس نے اس کا نب؟ اس بدتمیزی اور بدتہذیبی کے معنی کیا؟ میں آج معلوم کر کے رہوں گا۔ یہ حرکت کس نامعقول کی ہے"۔

باہر سے آواز آئی "اجی صاحب جواب کے لئے

کھڑے ہیں"۔

چچی یہ سب کیفیت دیکھ رہی تھیں۔ اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہی تھیں۔ آواز سن کر نہ رہا گیا بولیں" خدا کے لئے اب تم اس جرح کو بند کردو۔ اور لکھنا ہے تو خط لکھ دو۔ وہ غریب باہر کھڑا سوکھ رہا ہے۔ یہ قلم نہیں۔ تو میرا قلم موجود ہے۔ جا بنو میرا قلم لا دے"۔

چچا اس وقت جوش میں تھے۔ اور بزعم خویش محض ایک ذرا سی تکلیف کے لئے نہیں۔ بلکہ ایک اصول کی خاطر بات کو طول دے رہے تھے۔ اس وقت چچی پر بھی برس پڑے" تمہاری ہی شہ پاکر تو نوکر دل اور بچوں کی عادات بگڑ رہی ہیں۔ یہ ضرور ان ہی میں سے کسی کی حرکت ہے۔ کوئی بچہ یا ملازم ہمارے اس قلم سے تفریح کرتا رہا ہے۔ اور اسی نے اس کا نب ضائع کیا ہے۔ قلم کو سب غور سے دیکھو۔ اور سچ سچ بتاؤ کہ یہ حرکت کس کی ہے؟"

اتنے میں بنو چچی کا قلم لے آئی۔ چچا کا آخری فقرہ

سنکر اس نے قلم پر نگاہ ڈالی۔ تو بولی "لال قلم! ابامیاں کل آپ ہی نے تو ازار بند ڈالنے کو اس کا نب اُتارا تھا"۔

چچا نے گھور کر بنو کو دیکھا۔ قلم کو دیکھا۔ کچھ سوچا کھنکار کر گلا صاف کیا۔ کرسی پر پینترا بدلا۔ کنکھیوں سے چچی اماں پر نظر ڈالی۔ قلم بنو کے ہاتھ سے لے لیا۔ سر جھکا کر انگوٹھے کے ناخن پر اس کا نب پرکھنے لگے بولے "چلو اب اسی سے کام چل جائے گا"۔

بمقابلہ پچھلی گفتگو کے آواز کا سر بہت مدھم تھا۔

جو لڑکا دوات لئے کھڑا تھا۔ اسے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ خط لکھنا شروع کیا۔ القاب ہی لکھا ہوگا۔ کہ بولے "ہٹی ہے۔ یہ کیا لکھ گیا ہیں"! خط کا کاغذ پھاڑ ڈالا دوسرا منگوایا۔ ڈوبا لیا۔ لیکن لکھتے لکھتے رک گئے۔ بہت دیر تک مضمون سوچتے رہے۔ آخر پھر لکھنا شروع کیا۔ نب اتنی دیر میں خشک ہو چکا تھا۔ آپ سمجھے دوات میں سیاہی کم ہے۔ قلم بے تکلف دوات میں ڈال دیا

تحریر شروع کرنے کی دیر تھی۔ کہ سیاہی کا یہ بڑا دھبّا کاغذ پر! لاحول کہہ کر اس کاغذ کو بھی پھاڑ ڈالا۔ تیسرا کاغذ منگوایا۔ اس پر دو تین سطریں لکھ گئے۔ اس کے بعد قلم روک۔ جو کچھ لکھا تھا پڑھا۔ چہرے پر کچھ قبض کی سی کیفیات نمودار ہوئیں۔ چچی کی طرف دیکھا۔ خط کو دیکھا چپکے سے پھاڑ ڈالا ہلکے سے مودے سے کہا "خط کے کاغذوں کی کاپی ہی لے آؤ"۔

کاغذوں کی کاپی کی کاپی آگئی۔ اور رقعے کا جواب بے فکری سے لکھا جانا شروع ہو گیا۔ کبھی قلم کا شکوہ کہ نب درست نہیں۔ نیا نب ہے۔ کبھی دوات کی شکایت کہ سیاہی ٹھیک نہیں پھیکی ہے۔ کبھی جاذب برا۔ کہ یہ جاذب ہے یا پتنگ بنانے کا کاغذ۔ ہر شکوہ ایک نیا کاغذ ضائع کرنے کی تمہید۔ اسی میں پون گھنٹہ ہونے آگیا۔ باہر ملازم آوازوں پر آوازیں دے رہا ہے۔ ادھر چچی فارغ ہو چکی ہیں۔ اور یہ قصہ ختم کرنے کا تقاضا کر رہی ہیں۔ بار بار کہہ رہی ہیں۔ کہ خدا کے لئے تم مجھے دو

قلم دوات۔ میں ابھی دو منٹ میں لکھے دیتی ہوں خط۔ مگر چچا اپنی قابلیت کی یہ توہین کیونکہ برداشت کر لیں سٹپٹا گئے ہیں۔ مگر خط لکھنے سے باز نہیں آتے۔ پینترے پہ پینترا بدل رہے ہیں۔ اور کاغذ پہ کاغذ ردّی کئے چلے جا رہے ہیں۔

"میں کیا کروں۔ نہ قلم ٹھکانے کا نہ دوات درست لکھوں اپنے سر سے؟" ادھر یہ سب بلائیں میرے سر پہ آن چڑھی ہیں۔ ارے کمبختو۔ خدا کے لئے پرے ہٹ کر کھڑے ہو میرا دم اُلجھنے لگا ہے۔ بھان منی کا تماشا تو ہو نہیں رہا۔ کہ پلے پڑ رہے ہو۔ کبھی دیکھا نہیں خط کیونکر لکھا جاتا ہے؟ . . . اچھا بھئی سن لیا۔ سن لیا۔ ذرا دم لو۔ خالی تو بیٹھے نہیں۔ جواب ہی لکھ رہے ہیں . . . ارے بھئی خدا کے لئے دوات ورے لاؤ۔ اب میں ہر بار کرسی پر سے اٹھ کر ڈوبالوں . . . ؟ انہوں نے اور میرے آئے حواس غائب کر دئے ہیں۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی ہیں۔ نہ جانے کہاں کی عرضی نویس

ہیں۔ کہ دو منٹ میں جواب لکھ لیں گی۔ آخر دعوت منظور کرنی ہے۔ کچھ ٹکا سا جواب تو دینا نہیں۔ کہ دو حرف لکھ کر قصہ نمٹا دوں . . . ارے بھئی آ رہا ہے جواب تجھے کام ہے تو ہمیں کام نہیں ہے . . . ہٹی ہے۔ اے لو۔ اب نیچے اپنا نام لکھ گیا۔ میری عمر جُدا کی طرف سے خطوں کا جواب لکھنے میں تو گذری نہیں کہ ان باتوں کا خیال رہے . . . میں تھپیڑ ماروں گا۔ اگر پھر دوات پرے ہٹائی۔ ایک جگہ ہاتھ ہی نہیں رکھتا۔ نالائق بیہودہ کہیں کا۔ کام چور نوالہ حاضر۔"

اب تفصیل کہاں تک عرض کروں۔ پورے ڈیڑھ گھنٹے میں خط ختم ہُوا۔ اور اسے جلدی جلدی بند کر کے چچا نے باہر ملازم کے حوالے کیا۔ اسے بھی ایک مختصر سا لکچر پلا یا۔" یوں دوسروں کے گھروں پر تو آئی ڈالنا بڑی بدتمیزی کی بات ہے۔ خط لکھنا کوئی مذاق نہیں ہے، ایسا ہی سہل کام ہوتا۔ تو تم سرکاری پیر پیا کر کے روزی کیوں کماتے۔ آج کہیں منشی گیری نہ کر رہے

ہوتے؟ . . . خیر اب زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ۔ تمہیں کیا معلوم تمہارے میاں لکھنے سے پہلے کے گھنٹے سوچ بچار کرتے ہیں"۔

خط دے کر چچا گھر میں آئے ۔خوش تھے ۔کہ دیر ہوئی تو کیا ہوا ۔خط لکھا تو گیا۔ اطمینان سے ہاتھ ملنے لگے۔ چچی بھری بیٹھی تھیں ۔بولیں" خالی ہاتھ ملنے سے کیا ہوگا۔ صابن ملو تو انگلیوں کی سیاہی چھوٹے"۔

چچا نے انگلیوں کو دیکھا ۔تو واقعی کالی سیاہ ہو رہی تھیں ۔ابھی کچھ بولنے نہ پائے تھے کہ چچی نے ایک اور فقرہ کسا" خیریت گزری ۔کہ بھنگن کے آنے سے پہلے خط لکھ لیا گیا ۔ورنہ اسے بھی اطلاع دینی پڑتی ۔کہ دوبارہ آئے ۔میاں نے آج ایک خط لکھا ہے"۔

چچا نے کنکھیوں سے صحن کو دیکھا ۔جس کرسی پر بیٹھ کر خط لکھا تھا ۔اس کے چاروں طرف ردّی کاغذوں کی پڑیاں بکھری پڑی تھیں ۔کچھ کہنا چاہا۔ مگر فقرہ منہ ہی میں رہ گیا ۔ اَن سُنی کر غسل خانے میں

گھس گئے، ہاتھ دھو کر مردانے میں جا بیٹھے۔ بھنگن آکر صحن صاف کر گئی۔ تو اندر آئے۔ حقہ بھروایا۔ بیٹھ کر پینے لگے۔ چچی کی باتیں دل میں کھٹک رہی تھیں۔ ان کی گوش نوازی کے لئے اپنے آپ کو مخاطب کر کے باتیں شروع کر دیں "اعتراض کرنے کو سب تیار ہیں۔ اس پھوہڑ گھر میں جہاں نہ کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر رہتی ہے۔ نہ کوئی نوکر سلیقے کا موجود ہے۔ کوئی اس سے جلدی خط لکھ کر مجھے دکھائے تو میں جانوں، اور خط لکھنے کا کیا ہے۔ خط چاہو۔ تو منٹ بھر میں لکھ لو۔ مگر وہ کیا خط کہ جس کی نہ املا درست نہ انشا صحیح۔ خط وہ کہ جسے لکھا جائے وہ پڑھ کر جھومنے لگے۔ اور اسے یادگار کے طور پر سنبھال کر رکھے"۔

چچی خوب جانتی ہیں۔ کیسے موقعوں پر جلد صلح صفائی کر لینی چاہیے۔ معلوم تھا۔ کہ بات جلد نہ بھلادی۔ تو تمام دن ایسی ہی جلی کٹی جاری رہیں گی۔ بولیں" تو یہ کب کہا میں نے کہ جواب اچھا نہ لکھا گیا ہوگا؟"

بس خوش ہو گئے چچا۔" وہ نوان کے نوکر کو جلدی پڑی تھی۔ ورنہ میں تمہیں پڑھ کر سناتا۔ تب تم داد دے سکتیں۔ رات کو دعوت پر منصرم صاحب کی بیوی خط کے متعلق کچھ کہیں۔ تو مجھے بتا ضرور دینا۔ ویسے یہ چاہے ان سے نہ کہنا۔ کہ ہم نے لکھا تھا۔ بہرحال تمہیں اختیار ہے۔"

لیکن لطف اُس وقت آیا۔ جب دوپہر کو منصرم صاحب کی بیوی کے ہاں سے پھر ایک لفافہ آیا۔ جس میں چچا چھکن کا لکھا ہوا خط رکھا تھا۔ اور ساتھ ہی اس مضمون کا ایک رقعہ تھا۔ "پیاری بہن شاید غلطی سے کسی اور کے نام کا خط میرے نام کے لفافے میں رکھ دیا گیا۔ واپس بھیجتی ہوں۔ براہ مہربانی اطلاع دیجئے۔ کہ آپ رات کو تشریف لا سکیں گی یا نہیں؟"

"چچی نے چچا کا لکھا ہوا خط پڑھا۔ تو اس کی عبارت یہ تھی:۔

جمیل المناقب عمیم الاحسان زاد عنایتکم۔ یہاں بفضل ایزد متعال مالا مال خیریت ہے۔ اور صحت و تندرستی آپ

کی بدرگاہ مجیب الدعوات خمس الاوقات متدعی ہوں۔ صورت حال یہ ہے۔ کہ تلطف نامہ ساعت مسعود میں ورود ہوا۔ ارشاد سامی و حکم گرامی کے امتثال میں عذر کرنا بندگانِ مروّت و فتوت سے کیونکر ممکن ہے۔ طمانیت کُلّی ہو کہ وقت معین پر حاضری کے شرف و افتخار کا حصول مایۂ ناز متصور ہوگا ے

الٰہی در جہاں باشی باقبال
جواں بخت و جواں دولت جواں سال

(نمیقہ حقیر پر تقصیر)

یہ خط آنے کے بعد چچا چھکن بار بار مختلف پیرایوں میں اپنی اس رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ کہ عورتیں عموماً اور منصرم صاحب کی بیوی خصوصاً ناقص العقل اور نامعقول ہیں۔ اور تجھی کہ ان کی دعوت ہرگز قبول نہ کرنی چاہئے تھی۔

# چچا چھکّن نے جھگڑا چکایا

پچھلی گرمیوں میں اتوار کا روز تھا۔ ہمارے ہاں چراغ میں بتّی پڑتے ہی کھانا کھا لیا جاتا ہے۔ بچّے کھانا کھا کر سو گئے تھے۔ چچی نے کھانا نمٹا کر عشا کی نماز کی نیت باندھی تھی۔ نوکر باورچی خانے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ چچا چھکن بنیان پہنے۔ تہمد باندھے۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے چارپائی پر لیٹے مزے مزے سے حقّے کے کش لگا رہے تھے۔ کہ دفعتہً گلی میں سے شور و غل کی آواز آئی۔

بندو۔ امامی۔ مودا کھانا چھوڑ دروازے کی

طرف لپکے۔ چچا بھی چونک کر اٹھ بیٹھے۔ اُدھر کوئی نظر نہ آیا تو چچی کی طرف دیکھا۔ چچی نے سلام پھیرتے ہوئے منہ ادھر موڑا۔ آنکھیں چار ہوئیں۔ تو چچا نے پوچھا۔ "یہ شور کیسا ہے؟" چچی ماتھے پر تیوری ڈال وظیفہ پڑھنے لگیں۔

چچا چھکن کچھ دیر انتظار کرتے رہے۔ کہ شاید کوئی نوکر لڑکا پلٹ کر آئے۔ اور کچھ خبر لائے۔ ویسے چچی سے برابر پوچھتے رہے۔ "کوئی آتا نہیں!... کہاں بیٹھ رہے سب کے سب؟... دیکھیئی ہو ان کی حرکتیں؟ معلوم نہیں کیا واردات ہوگئی" لیکن جب نہ چچی نے کچھ جواب دیا اور نہ کوئی لڑکا واپس آیا۔ تو مجبوراً کو اُٹھے۔ اور جوتا پہن خود باہر نکلنے کی تیاری کی۔

چچی بولیں "چلے تو ہو۔ کسی کے جھگڑے میں نہ پڑنا"

چچا بولے "میرا سر پھرا ہے۔ بازاری لوگوں کے جھگڑوں سے ہمیں کیا سروکار"

زنان خانے سے نکل مردانے میں آئے۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھا۔ تو دیکھا کہ گھر کے سامنے بھیڑ جمع ہے۔

چچا کو توقع نہ تھی۔ کہ اتنی جلدی موقع پر جا پہنچیں گے۔ کچھ گھبرائے۔ آگے بڑھنے کے لئے ابھی تیار نہ تھے۔ واپس ہٹنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ چنانچہ آپ نے جلدی سے دیا گل کر ڈیوڑھی کا دروازہ بھیڑ دیا۔ اور دیر تک درز سے آنکھ لگائے صورت حالات ملاحظہ فرماتے رہے۔

معلوم ہوا۔ کہ جھگڑا دو ہمسایوں کے درمیان ہے جو سامنے کے مکان میں رہتے ہیں۔ ایک اوپر کی منزل میں دوسرا نیچے کی منزل میں۔ ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ لیکن لوگوں نے اب دونوں کو الگ الگ کر کے سنبھال رکھا ہے۔ اور میر باقر علی سمجھا بجھا کر انہیں تقریباً ٹھنڈا کر چکے ہیں۔

پچا سے نہ رہا گیا۔ یہ بات انہیں کیونکر گوارا ہو سکتی تھی۔ کہ ان کے ہوتے ساتے محلے کا کوئی اور شخص اس قسم کے قصوں میں پنچ بن بیٹھے۔ چنانچہ آپ تہمد کس بنیان نیچے کھینچ۔ دروازہ کھول باہر نکل کھڑے ہوئے۔ اور بڑے سرپرستانہ انداز میں بولے "ارے

بھئی کیا واقعہ ہو گیا؟"

میر باقر علی نے کہا۔" اجی کچھ نہیں۔ یوں ہی ذرا سی بات پر ان خاں صاحب اور مولوی صاحب میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں نے سمجھا دیا ہے دونوں کو۔"

وہ تو سمجھ گئے۔ مگر چچا بھلا کہاں سمجھتے ہیں۔ موقع پر جا پہنچے بولے" مگر بات کیا ہوئی۔ یہ تو کچھ ایسا نقشہ نظر آتا ہے۔ جیسے خدانخواستہ فوجداری تک نوبت پہنچ گئی تھی"۔

میر باقر علی نے ٹالنا چاہا۔" اجی اب خاک ڈالیئے اس قصے پر۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ ہمسایوں میں دن رات کا ساتھ۔ کبھی کبھی شکایت پیدا ہو ہی جاتی ہے"۔

اب بھی چچا کی تسکین نہ ہوئی۔ بولے" پر زیادتی آخر کس کی طرف سے ہوئی؟"

خاں صاحب بولے"۔ پوچھئے ان مولوی صاحب سے۔ جو بڑے متقی بنے پھرتے ہیں۔ ڈاڑھی تو بالشت بھر بڑھا رکھی ہے لیکن جب حرکتیں رذیلوں کی سی ہوں

تو ڈاڑھی سے کیا فائدہ؟"

چچا چونک کر بولے "اوہو یہ قصہ تو بڑھا معلوم ہوتا ہے!"

اب مولوی صاحب کیسے چپ رہ سکتے تھے۔ بولے "صاحب ان کو کوئی چپ کرائے۔ میں بڑی دیر سے طرح دئے جا رہا ہوں۔ اور یہ جو منہ میں آئے بکے چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ان کے حق میں اچھا نہ ہوگا"۔

خاں صاحب کڑک کر بولے "ابے جا۔ چار بھلے آدمی بیچ میں پڑ گئے۔ جو میں رک گیا۔ نہیں تو نتیجہ تو آج ایسا بتاتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا"۔

مولوی صاحب نے تن کر فرمایا "طاقت کے گھمنڈ میں نہ رہنا خاں صاحب۔ انگریز کا راج ہے۔ جی ہاں اور یہاں بھی کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔ ہم بھی ایسے ہتھیاروں پر اتر آئے۔ تو یاد رکھئے۔ ورنہ جی ہاں"۔

خاں صاحب بے قابو ہو گئے۔ مکا تان کر بڑھا چاہتے تھے۔ کہ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے روک لیا۔ مولوی

صاحب آستینیں چڑھاتے چڑھاتے رہ گئے۔ باقر علی صاحب نے پریشان ہو کر چچا چھکن سے کہا "دونوں کے دونوں اچھے خاصے سمجھ گئے تھے۔ آپ نے پھر دونوں کو بھڑکا دیا"۔

چچا بولے "لاحول ولا قوۃ۔ کہنے لگے کہ آپ نے بھڑکا دیا۔ اجی حضرت میں تو صرف اتنا پوچھ رہا تھا کہ قصور کس کا ہے۔ آپ جو بڑے پنچ بن کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ تو اتنا تو معلوم کر لیا ہوتا۔ کہ زیادتی کس کی ہے۔ اور اصل واقعہ کیا ہے"۔

باقر علی نے پھر بات ٹالنی چاہی "اجی کہاں اب سر راہ قصہ سنئیے گا جانے دیجئے۔ جو ہوا سو ہوا۔ میں تو ان دونوں کی شرافت کی داد دیتا ہوں۔ کہ جو ہم نے کہا۔ اُنہوں نے مان لیا۔ بات رفت گزشت ہوئی۔ اب آپ کیا گڑے مُردے اُکھیڑنے آ گئے"۔

چچا نے دیکھا۔ میر باقر علی چھاتے چلے جا رہے ہیں آگ ہی تو لگ گئی۔ لیکن سنبھل کر بولے "صاحب من آپ کو اس محلے میں آئے ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا۔ کے

آدمی کے پیر شندی۔ اور ہماری تو نال اسی محلے میں گڑی ہوئی ہے۔ اب آپ جانے دیجئے نا اس بات کو۔ بازی بازی باریش بابا ہم بازی۔ اور سر راہ کا کیا ہے۔ یہ جھگڑا ہم تک آج نہ پہنچتا۔ کل پہنچ جاتا۔ سو اب بھی کیا مضائقہ ہے۔ سامنے ہی تو غریب خانہ ہے۔ اندر چل بیٹھیں۔ دو منٹ میں قصہ طے ہوا جاتا ہے۔ مجھے تو یہ ہرگز گوارا نہیں۔ کہ جس محلے میں سبھی رہتے ہوں۔ وہاں ہمسایوں میں یوں سر بازار جوتی پیزار ہوا کرے"۔

یہ کہہ کر چچا نے داد طلب نگاہوں سے مجمع کو دیکھا بولے "کیوں صاحب۔ خدا لگتی کہئے۔ یہ بھلا کوئی شرافت ہے؟"

مجمع میں سے تائید کی بھنبھناہٹ سی سنائی دی۔ میر صاحب خاموش ہو کے رہ گئے۔ چچا بولے "تو آپ دونوں صاحب اندر تشریف لے آئیے نا۔ اور میر صاحب اگر چاہیں تو میر صاحب بھی آ سکتے ہیں"۔ باقی لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا "آپ حضرات جا سکتے ہیں۔ یہاں

کوئی بھانڈ تو ناچیں گے نہیں۔ جو آپ کو مدعو کروں۔ آپس کے جھگڑے طے کرانا مغز پاشی کا کام ہے۔ آپ لوگ اپنے اپنے گھر جا کر آرام کیجئے"۔

بیچے صاحب چچا قاضی القضاۃ بن گئے۔ مدعی اور مدعا علیہ اور میر صاحب کو ساتھ لئے گھر میں آئے۔ گھر پہنچ کر پہلے مردانے ہی سے فرامین کی ایک فہرست صادر ہوئی۔ کہ بندو لمپ لائے۔ اور مودا برف کا پانی بنائے۔ اور امامی حقہ تازہ کر کے پہنچائے۔ اور بندو لمپ لا چکنے کے بعد خاصدان لے کر آئے۔ اور مودا پانی بنا چکنے کے بعد اُگالدان لا کر رکھے اور امامی حقے سے فراغت پا کر پنکھا جھلے۔

سب کو دیوان خانے میں بٹھایا۔ خود یہ کہہ کر اندر گئے۔ کہ میں ابھی حاضر ہوا۔ اندر جا کر بنیان پر چکن کا کرتہ پہنا۔ پہن ہی رہے تھے۔ کہ چچی نے جلدی جلدی رکعت ختم کر سلام پھیر کے پوچھا "کیا بات ہے"؟

چچا بے پروائی کے انداز میں بولے "عجب حالت

ہے لوگوں کی۔ نہ دن کو چین لینے دیتے ہیں نہ رات کو
ان سامنے والے خاں صاحب اور مولوی صاحب کا
جھگڑا ہو گیا۔ مصیبت میں میری جان پڑ گئی۔ سب مُصر
ہیں۔ کہ آپ بیچ میں پڑ کے فیصلہ کرا دیجئے۔ بات ٹالی بھی
نہیں جا سکتی۔ محلّے کا معاملہ ٹھیرا۔ بہر حال بر سرا ولاد
آدم ہرچہ آید بگزرد۔ تو تم نماز سے فارغ ہو کر پان کے
کچھ ٹکڑے لگا کے بھیج دینا"۔

چچی جل کر بولیں "یہ شوق بھی پورا کر لیجئے"۔

چچا کُرتے کے بٹن لگاتے ہوئے باہر نکلے۔ دیوان
خانے میں پہنچ کر آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ ٹانگیں سمیٹ
کر اوپر دھر لیں۔ بولے "میں حاضر ہوں۔ فرمایئے کیا بات
ہوئی۔ سارا واقعہ بیان کیجئے۔ لیکن مختصر طور پر"۔

مولوی صاحب اور خاں صاحب دونوں کی
تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ منہ پھلائے لال لال آنکھوں
سے ایک اِس طرف ایک اُس طرف تک رہا تھا چچا
کا تقاضا سُن دونوں کچھ کسمسائے۔ مگر چپکے بیٹھے

رہے۔ میر صاحب نے مہرِ سکوت توڑی۔" حضرت بات تو اصل میں بڑی معمولی تھی"۔

چچا نے کہا۔" آپ تمہید کو جانے دیجئے مطلب کی بات کہئے"۔

میر صاحب نے غصّے کو پی کر کہا۔" تو اور کیا کہوں بات حقیقت میں نہایت معمولی ہے لیکن . . ."

خاں صاحب سے ضبط نہ ہو سکا۔" کوئی آپ کی بہو بیٹیوں کو یوں دیکھتا۔ اور آپ اسے معمولی بات کہتے تو جانتا"۔

چچا کرسی پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ مستورات کا واقعہ ہے۔ تو واقعی حضرت اسے معمولی بات کہنا تو بڑی زیادتی ہے آپ کی۔ خاں صاحب آپ خود ہی جو واقعہ بیان کیجئے"۔

باقر علی صاحب خاموش ہو گئے۔ خاں صاحب کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ بولے" آپ سا منصف مزاج بزرگ پوچھے گا۔ تو بیان کروں گا ہی۔ آپ سے کیا پردہ

ہے"۔

چچا پھول گئے۔ کچھ کہنا ضروری معلوم ہوا۔ "نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ آپ بلاتکلف کہئے"۔

خاں صاحب نے کہا۔ "آپ کو علم ہی ہے۔ کہ اس سامنے کے مکان کی نچلی منزل میں ہم رہتے ہیں۔ اور اوپر کی منزل میں ایک کھڑکی ہے۔ جس سے ہمارے مکان کے صحن میں نظر پڑتی ہے"۔

چچا نے بات کاٹ کر فرمایا۔ "جی ہاں جی ہاں میری دیکھی ہوئی کیا میرے سامنے بنی۔ اور ایک اس کھڑکی کا کیا ذکر اس سارے مکان کی تعمیر میں میرا بہت کچھ دخل رہا۔ مالک مکان فضل الرحمٰن خاں کے مجھ سے مراسم تھے۔ حیدر آباد جانے سے پہلے ہر روز شام کو ملنے آتے تھے۔ اور سچ پوچھئے انہیں یہ مشورہ بھی میں نے ہی دیا تھا۔ کہ خالی زمین پڑی ہے۔ اور کوڑیوں کے مول بک رہی ہے۔ تو کچھ ایسی صورت کرنی چاہئے۔ کہ کرائے کی ایک سبیل نکل آئے۔ تو انہوں نے یہ گویا

مکان بنایا۔ خیر تو یہ جملہ معترضہ تھا۔ آپ بات کہئے"۔

خاں صاحب نے سوچا۔ کہ بات کہاں تک کی تھی۔ بولے "جی۔ تو اوپر کی منزل میں ایک کھڑکی ہے کہ اس سے ہمارے ہاں کے صحن میں نظر پڑتی ہے۔ ہم اس مکان میں پہلے سے رہتے ہیں۔ یہ حضرت بعد میں آئے۔ آتے ہی ہم نے ان سے کہہ دیا۔ کہ مولوی صاحب اس کھڑکی میں اگر آپ تالا ڈلوا دیں تو مناسب ہے۔ ورنہ عورتوں کا سامنا ہوا کرے گا۔ اور مفت میں کوئی نہ کوئی قصّہ کھڑا ہو جائے گا"۔

چچا نے داد دی "بہت مناسب کارروائی کی آپ نے۔ قانونی نقطۂ نظر سے گویا آپ نے ایک ایسی پیش بندی کر لی۔ کہ بعد میں اگر کسی قسم کی بھی شکایت پیدا ہو۔ تو آپ کو گرفت کا جائز موقع ملے۔ بہت ٹھیک۔ جی تو پھر؟"

خاں صاحب داد سے بہت مسرور ہوئے "خدا حضور کا بھلا کرے۔ میں نے سوچا نیئے آدمی ہیں۔ کیوں

نہ پہلے ہی سے خبردار کردوں، سو صاحب انہوں نے بھی مجھے یقین دلایا۔ کہ کھڑکی میں تالا ڈال دیا گیا ہے اور مَیں بے فکر ہو گیا، اب جناب آج صبح کو کیا ہوا کہ۔۔۔"

"یہ لیجئے۔ ٹھنڈا پانی پیجئے۔ آپ بھی لیجئے مولوی صاحب۔ پانی دے بے میر صاحب کو۔۔۔ جی تو آج صبح۔۔۔ ابے رکھ دے میز پر خاصدان۔ سر پر کیوں سوار ہو گیا ہے۔ اور وہ امامی کہاں مر رہا؟ ابھی تک حقّہ نہیں بھر اگیا؟ جی صاحب آپ کہے جایئے مَیں سن رہا ہوں، ہاں اور وہ اُگالدان؟ کہ بھی دیا تھا۔ پھر بھی یاد نہیں رہا۔ بڑے نالائق ہو تم لوگ۔ آپ فرمایئے نا خاں صاحب؟"

خاں صاحب نے کچھ دیر سکون کا انتظار کیا۔ آخر بولے۔"جی تو آج صبح اِدھر میں دکان پر روانہ ہُوا۔ اُدھر اوپر کی منزل میں ایک بچے نے کھڑکی کھول دی عورتیں صحن میں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے کھڑکی بند کرنے کو کہا تو یہ حضرت خود کھڑکی میں آن موجود ہوئے۔ اور بدیں

ریش وش عورتوں کو دیکھنے لگے۔ اب آپ ہی فرمایئے۔ کہ یہ شریفوں اور مولویوں کی سی باتیں ہیں یا لچوں اور شہدوں کی سی حرکتیں؟"

چچا نے عالم استعجاب میں آنکھیں کھولیں۔ گردن جھکا لی۔ اور پھر ایک حاکمانہ انداز میں سر پھیر کر مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ بولے "مولوی صاحب یہ تو آپ نے ایسی نامناسب اور خلاف شرع حرکت کی۔ جس پر آپ کو جس قدر الزام دیا جائے بجا ہے"۔

مولوی صاحب دیر سے بیٹھے خاموش دیکھ رہے تھے۔ کہ چچا ہمدردانہ انداز سے خاں صاحب کی گفتگو سن رہے ہیں۔ اب چچا نے انہیں مخاطب کیا۔ تو وہ بھڑک اٹھے "سبحان اللہ آپ بھی عجب سادہ لوح شخص ہیں۔ جو کچھ کسی نے افترا باندھا۔ جھٹ اس پر ایمان لے آئے۔ واہ صاحب واہ!"

چچا کو یہ انداز کلام کسی قدر ناگوار گزرا۔ "تو آپ کو یہ خیال ہے۔ کہ میں خاں صاحب کی ناجائز حمایت

کر رہا ہوں"؟

مولوی صاحب بولے "ناجائز حمایت تو ہے ہی آپ پہلے میری عرض بھی تو سنیئے۔ کہ مَیں کیا کہتا ہوں"
چچا بے ضابطگی کا الزام سُنکر چڑ گئے۔ بولے "تو بیان کیجئے کہ آپ کیا عرض کرنا چاہتے ہیں۔ مگر عرض ہو۔ طول نہ ہو۔ مجھے اختصار بہت مرغوب ہے"۔

مولوی صاحب بولے "جی مَیں بہت مختصر طور پر سب کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔ ہم نے تو مکان میں آتے ہی کھڑکی میں تالا ڈال دیا تھا۔ چنانچہ آج تک کبھی کوئی وجہ شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ آج اتفاقیہ بچے کے ہاتھ چابی لگ گئی۔ اور اس نے کھڑکی کھول دی۔ اور کھڑکی میں کھڑا ہو کر ان کے بچّوں کو آوازیں دینے لگا۔ مَیں نے جب . . ."

لیکن بیان ختم ہونے سے پہلے ہی چچا نے جرح شروع کر دی۔ "تو آپ کا بیان یہ ہے۔ کہ محض آوازیں دینے کے لئے کھڑکی کا تالا کھولا تھا۔ محض آوازیں دینے

کے لئے محض؟ خوب۔ اس کے لئے بھلا کھڑکی کھولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

مولوی صاحب بولے۔" آخر بچہ ہی تو تھا۔ اسے بھلا نیک و بد کی کیا تمیز۔ اسے یہ تھوڑا ہی معلوم۔ کہ صاحب یہ تالا نہ کھولنا چاہیئے۔ اور وہ کھڑکی بند رہنی چاہیئے۔ چابی مل گئی تھی۔ تالے پر نظر پڑی۔ کھول ڈالا"۔

چچا ہونٹ سکوڑ سکوڑ کر اور ایک آنکھ میچ کر یوں سر ہلاتے رہے۔ گویا مولوی صاحب کے اس جواب میں بھی انہیں ایسے ایسے معانی نظر آرہے ہیں۔ جو دوسروں کی فہم سے بالاتر ہیں۔

مولوی صاحب نے اپنا بیان جاری رکھا۔" میں نے کھڑکی جو کھلی دیکھی۔ تو فوراً بند کرنے کو لپکا۔ اور کواڑ بند کر کے اسی وقت تالا لگا دیا"۔

چچا نے پھر ٹوکا۔" کیوں حضرت یہ آپ کے گھر میں تالا کھولنا تو بچوں کو بھی آتا ہے۔ مگر بند کرنا آپ کے سوا کسی کو نہیں آتا؟ خوب"!

میر باقر علی صاحب بولے۔" حضرت یہ ایک اضطراری حرکت تھی۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انہیں اس کھڑکی کے بند رکھنے کا ہر وقت خیال رہتا تھا، کھلی دیکھی تو یک لخت بند کرنے کو لپکے"۔

مولوی صاحب نے مزید صفائی کے خیال سے کہا "خدا شاہد ہے۔ جو مجھے یہ گمان بھی گزرا ہو۔ کہ صحن میں مستورات موجود ہوں گی۔ یا میں نے اس طرف نظر بھی ڈالی ہو، یہ سراسر بہتان ہے۔ کہ میں کھڑا رہا۔ بلکہ میں نے تو بعد میں نیچے کہلا کر بھی بھیجا۔ کہ مجھے بڑا افسوس ہے۔ کہ بچے نے کھڑکی کھول دی تھی"۔

میر صاحب نے مولوی صاحب کے چال چلن کے متعلق شہادت دی۔" مولوی صاحب جب سے یہاں آئے ہیں۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ میرے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ روز کا آنا جانا ہے۔ اور میں وثوق سے کہتا ہوں۔ کہ یہ اس قسم کے آدمی نہیں۔ چنانچہ میں نے خاں صاحب سے بھی یہی کہا تھا۔ کہ مستورات کو غلط فہمی ہو گئی ہو گی

ورنہ مولوی صاحب سے کسی بُرے خیال کی توقع نہیں ہو سکتی"۔

لیکن چچا بھلا کسی دوسرے کی رائے کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔ بولے" دلوں کا حال خدا وند عالم بہتر جانتا ہے۔ اور اس کے متعلق کچھ کہنے کی جرأت کرنا میری رائے میں کفر ہے۔ بہرحال ابھی سب کچھ کُھلا جاتا ہے۔ تو جناب مولوی صاحب آپ ریلوے کے دفتر میں کلرک ہوتے ہیں نا؟ خوب! اور آپ کو اتوار کے روز چھٹی بھی ہوتی ہے؟ بہت خوب۔ اور جناب من آج اتوار ہی کا دن تھا؟ نہ نہ فرمایئے تھا یا نہیں؟ خدا آپ کا بھلا کرے تھا۔ اور جناب اتوار کے روز آپ گھر ہی میں رہتے ہیں۔ بجا . . . تو سوال یہ ہے۔ کہ اگر کھڑکی کُھلنی تھی تو اتوار ہی کے روز کیوں کُھلی جب آپ گھر میں موجود تھے؟ کسی اَور دن کیوں نہ کُھلی؟"

یہ کہہ کر چچا نے نتھنے پھلا کر فاتحانہ انداز سے باری باری سب پر یوں نظر ڈالی۔ گویا کوئی بڑا اہم نکتہ

نکال کر مولوی صاحب کو لاجواب کر دیا ہے۔

مولوی صاحب اس استدلال سے پریشان سے ہو گئے تھے۔ بولے "حضرت اس بات کی اہمیت کچھ واضح طور پر میری سمجھ میں نہیں آئی۔ باقی واقعہ یہ ہے کہ کھڑکی کی چابی گچھے میں ہے۔ گچھا میرے پاس رہتا ہے۔ جب میں گھر پر ہوں گا۔ تب ہی گچھا گھر پر ہوگا اور اُسی وقت کھڑکی کھُلنے کا امکان بھی ہے"۔

چچا کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ سر پیچھے کو ڈال کرسی پر لیٹ گئے۔ اور بولے "اب یہ آپ کی کج بحثی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے۔ کہ اس بات کا جواب آپ کے پاس کچھ نہیں"۔

مولوی صاحب نے نہ معلوم دانستہ یا نادانستہ چچا کو تھوڑا سا روغن قاز ملا۔ بولے "صاحب جو اصل واقعہ تھا۔ وہ تو میں نے عرض کر دیا۔ اب آپ اپنی علمیت اور قابلیت سے جو نکتہ چاہیں نکال سکتے ہیں۔ اور مجھ سے جاہل کی کیا بساط۔ کہ بحث میں آپ سے پیش

چل سکے"۔

چچا خوش ہو گئے۔ مولوی صاحب کے خلاف جو جذبہ اندر ہی اندر کام کر رہا تھا۔ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ایسے انداز میں ہنس پڑے۔ گویا دانستہ محض تفریح کی غرض سے منطق کے شعبدے دکھا رہے تھے۔ مسکرا کر بولے" معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو بھی منطق سے دل چسپی ہے . . . لے آیا بے حقہ؟ رکھ دے اِدھر۔ اچھا اُدھر ہی رکھ دے۔ لیجئے مولوی صاحب۔ نہ نہ لیجئے نا۔ ذرا تمباکو ملاحظہ فرمایئے گا۔ براہ راست مراد آباد سے منگواتا ہوں۔ ورنہ یہاں کا تمباکو تو آپ جانئے نرا گوبر ہوتا ہے۔ مراد آباد میں اپنے ایک عزیز ہیں۔ کلکٹری میں پیشکار ہیں۔ مگر صاحب ان کے رسوخ کا کیا کہنا۔ تو وہ کبھی کبھار یاد کر لیتے ہیں"۔

مولوی صاحب نے حقے کے کش لگانے شروع کئے۔ خاں صاحب نے دیکھا۔ کہ چچا تو مولوی صاحب پر ریشہ خطمی ہوئے جا رہے ہیں۔ غصے سے لال پیلے ہو گئے بولے" جس بات کے لئے آپ نے ہمیں بلایا تھا۔ وہ تو . . ."

چچا نے بات کاٹ کر کہا "جی ہاں دیکھئے میں عرض کرتا ہوں۔ تو جناب من باقی رہا اس جھگڑے کا قصّہ۔ تو خاں صاحب میری ذاتی رائے پوچھئے۔ تو تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجا کرتی۔ دنیا میں آج تک جتنے بھی جھگڑے ہوئے۔ ہمیشہ ان کا تعلق فریقین سے رہا ہے"۔

خاں صاحب نے بے اختیار پوچھا "اس جھگڑے میں بھلا میرا کیا قصور تھا؟"

چچا نے جواب دیا "ارے بھئی کچھ نہ کچھ ہوتا ہی ہے نا۔ تمہارا نہ سہی۔ تمہارے گھر والوں کا سہی۔ مثلاً اب بھلا انہیں اُس وقت صحن میں بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی وہاں باغ تو لگا ہوا نہیں۔ آپ کہیں گے۔ کہ وہ آپ کے گھر کا صحن تھا۔ ذرا دیر کو مان لیا کہ تھا مگر پھر اوپر کھڑکی کی طرف دیکھنا کیا ضرور تھا؟ ویسے میرا کوئی بُرا مقصد نہیں۔ تاہم دیکھئے نا۔ کہ بات کو بڑھایا جائے۔ تو کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ مطلب میرا یہ ہے۔ کہ ایسے معاملوں میں تو جتنا چھپا تو اتنی ہی کہ کل نکلتی

ہے"۔

میر صاحب اس کارروائی سے تنگ آ چکے تھے۔ بولے" اجی اب قصور ایک کا تھا یا دونو کا۔ اس بحث سے آخر کیا حاصل۔ آپ اس قصے کو اب کسی ایسی طرح چکایئے کہ آیندہ کے لئے ان دونو صاحبوں کا اطمینان ہو جائے۔ مَیں نے تو یہ تجویز کیا تھا۔ کہ آیندہ کے اطمینان کی غرض سے مولوی صاحب کی کھڑکی میں خاں صاحب اپنا تالا ڈال دیں"۔

چچا چھکن نے کنکھیوں سے میر صاحب کی طرف دیکھ کر پوچھا" کیا مراد؟"

میر صاحب نے کہا" مراد یہ۔ کہ مولوی صاحب کے مکان کی وہ کھڑکی مقفل رہے۔ اور اس کی چابی اطمینان کی غرض سے خاں صاحب اپنے پاس رکھیں"۔

تجویز چچا کو معقول معلوم ہوئی۔ لیکن چونکہ میر صاحب کی طرف سے پیش ہوئی تھی۔ اس لئے قبول کرنے کو دل نہ چاہا۔ بولے" نہیں نہیں نہیں یہ تو کچھ ...

اُوں ہوں . . . کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ اس طرح تو . . . یعنی خواہ مخواہ خاں صاحب اپنا ایک تالا بیکار کر ڈالیں؟ اور اپنے گھر میں کسی دوسرے کا ایسا دخل کسی غیرت مند کو کب گوارا ہو سکتا ہے؟ یہ تالا والا کچھ نہیں۔ کوئی اَور تجویز ہونی چاہئے۔ کوئی معقول تجویز جو طرفین کے لئے فائدہ مند بھی ہو۔ اور اطمینان کا باعث بھی ہو۔ کیوں صاحب اگر کھڑکی چنوا دی جائے۔ تو کیسا ہے؟"

خاں صاحب بولے" اول تو مالک مکان اب یہاں ہے نہیں اور اگر اسے لکھا بھی جائے۔ تو وہ اسے منظور نہ کرے گا۔ مَیں نے ایک مرتبہ کی تھی یہ تجویز پیش۔ وہ کہنے لگے۔ کہ اس کھڑکی کے بند ہونے سے کمرہ تاریک ہو جائے گا"۔

چچا نے کہا" یہ دوسری بات ہے۔ ورنہ تجویز خوب تھی۔ اپنا ہمیشہ کے لئے یہ قصہ ختم ہو جاتا۔ مثلاً آپ دونو کے چلے جانے کے بعد کوئی دو اَور کرائے دار آکر آباد

ہوتے تو ان میں بھی کسی قسم کی بدمزگی کا امکان نہ رہتا آپا ناخیال شریف میں؟ مگر یہ کمرے میں اندھیرا ہوجانے کا سوال بیشک ٹیڑھا ہے۔ خیر نہ سہی یوں۔ کسی اور ترکیب سے کام لے لیجئے۔ ترکیبیں بہت۔ بے حد و شمار مجھے تو صرف آپ لوگوں کی سہولت کا خیال ہے۔ ورنہ میں تو تجویزوں کا انبار لگا دوں۔ پریشان کر دوں آپ کو۔ بڑے بڑے قصے چکائے ہیں۔ اس ایک کھڑکی بیچاری کی کیا حقیقت ہے۔ تو یوں کیوں نہ کیجئے۔ مثلاً آپ دونوں میں سے ایک صاحب مکان خالی کر دیں اور کسی دوسری جگہ جا رہیں۔ کیوں صاحب کیا رائے ہے؟"

خاں صاحب اور مولوی صاحب پہلے کچھ منہ ہی منہ میں بولے۔ پھر خاں صاحب نے کہا "صاحب میں تو مکان چھوڑ نہیں سکتا۔ کہاں نیا مکان تلاش کرتا پھروں"۔

مولوی صاحب نے بھی معذوری ظاہر کی "حضرت

میرے لئے تو یہ فی الحال ناممکن ہے۔ اتنے کرائے میں اس قدر گنجائش بھلا اور کہاں ملے گی"!

چچا کی بے حد و شمار تجویزوں کا ذخیرہ اس پہلی ہی تجویز کے بعد ختم ہو چکا تھا" اب یوں آپ ہر تجویز میں ہیں، مینخ نکالنے لگے۔ تو طے ہو چکا آپ کا جھگڑا۔ یعنی مکان بدلنے میں آخر قباحت ہی کیا ہے؟ سیدھی سی بات ہے۔ کہ بھئی نہیں نبھتی الگ ہو جاؤ۔ نہ رہے بانس نہ بجے بنسری۔ کیا آپ کے خیال میں اس مکان کے سوا شہر بھر میں اور معقول مکان نہیں؟ یا اور مکان بال بچے دار لوگوں کے رہنے کے لئے نہیں بنوائے گئے؟ انکار کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیئے اس سے تو ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آپ لوگ صلح صفائی پہ آمادہ نہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ روز اسی قسم کے قصے کھڑے ہوا کریں۔ ایسی حالت میں میرا کوئی تجویز پیش کرنا دشوار ہے۔ آپ خود آپس میں نمٹ لیجئے۔

میر صاحب بے چارے پریشانی کے عالم میں یہ

باتیں سن رہے تھے اور کرسی پر بار بار پہلو بدلتے تھے آخر نہ رہا گیا۔ ہمت کر کے بولے۔ "میں نے تو عرض کیا تھا کہ دونوں کے لئے بہترین ترکیب وہی ہے۔ کہ کھڑکی میں تالا لگا رہے اور اس کی چابی . . ."

چچا جل گئے۔ "اجی آپ کیا ایک واہیات سی بات کو چمٹ گئے ہیں اور بار بار پیش کئے جا رہے ہیں۔ چابی تالا۔ چابی تالا۔ یعنی آپ نے تو ایسا کچھ سمجھ رکھا ہے۔ جیسے ایک تالے کی دوسری کنجی بنوائی ہی نہیں جا سکتی"۔

میر صاحب نے بھی جل کر جواب دیا۔ "پھر یوں تو دیوار کی اینٹیں بھی نکال کر جھانکا جا سکتا ہے"۔

بات چچا کی سمجھ میں نہ آئی۔ بولے "تب ہی تو کہا تھا۔ کہ ایک صاحب نقل مکان کر لیں۔ نہ مانیں تو اس کا کیا علاج۔ اچھی بات ہے۔ وہ ان کی عورتوں کو دیکھا کریں۔ یہ اُن کی عورتوں کو تاکا کریں"۔

خاں صاحب تاڑ گئے۔ بگڑ کر بولے "دیکھئے

صاحب منہ سنبھال کر بات کیجئے۔ عورتوں کا نام یوں ہی نہیں لیا جاتا۔ یہ ناموس کا معاملہ ہے۔ ہم غریب سہی۔ مگر نکٹے نہیں"۔

چچا کچھ کسمسائے۔ میر صاحب گھبرائے۔ مولوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے" تو صاحب میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ گھر پر بال بچے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ جب کوئی بات طے ہو چکے۔ تو مجھے اطلاع دے دیجئے گا"۔

خاں صاحب نے اُٹھ کر اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔" تمہارے بال بچے ہیں ہمارے بال بچے نہیں۔ پہلے فیصلہ ہو جائے پھر جانے دوں گا"۔

مولوی صاحب نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر خاں صاحب کی گرفت مضبوط تھی۔ بولے" تو اپنا تالا لاؤ۔ اور کھڑکی میں ڈال لو"۔

خاں صاحب بولے" تالا تم دو۔ چابی میرے پاس رہے گی"۔

چچا کو تو یہ تجویز شروع ہی سے نامرغوب تھی۔ بولے "نالا یہ کیوں دیں۔ بے پردگی تمہاری عورتوں کی ہوتی ہے یا ان کی؟"

چچا کی تائید سے مولوی صاحب کو بھی حوصلہ ہُوا بولے۔ "دیکھئے تو سہی"۔

خاں صاحب کو آگ لگ گئی۔ بڑھ کر مولوی صاحب کی گردن پر ہاتھ ڈالا۔

مولوی صاحب کے گلے سے ایک اس قسم کی آواز نکلی۔ جیسے ذبح ہوتے ہوئے بکرے کے گلے سے نکلتی ہے۔

میر صاحب "ہائیں ہائیں" کرتے لپک کر اُٹھے۔

چچا بولے "یہ ہاتھاپائی ٹھیک نہیں"۔

خاں صاحب نے میر صاحب کو دھکیلا۔ تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے دیوار سے جا لگے۔

چچا نے ہاتھ پکڑنا چاہا۔ تو ایک زنّاٹے کا تھپڑ اُنہیں بھی رسید کیا۔

میر صاحب تو چپکے کھڑے رہ گئے۔ چچا دو قدم پیچھے ہٹ کر بولے۔ "ہائی لوا!"

لیکن خاں صاحب کس کی سنتے ہیں۔ مولوی صاحب کو گردن سے پکڑ کر دھکیلتے ہوئے باہر نکل گئے۔

میر صاحب آوازیں سنتے ہی پھر باہر کو لپکے۔

چچا چپ چاپ جہاں تھے۔ وہیں کے وہیں کھڑے گال سہلاتے رہے۔

کھڑے ہی تھے۔ کہ پردہ اُٹھا۔ چچی اندر آگئیں۔ غصے کے مارے چہرہ تمتما رہا تھا۔ بولیں "میں کہتی نہ تھی کہ پرائے قصّے میں دخل نہ دینا۔ مگر میری بات اِس کان سن اُس کان اڑا دی۔ اب آیا ہوگا جھگڑا چکانے کا مزا۔ دو کوڑی کا شخص بے آبرو کر گیا۔"

چچا اس کے لئے تیار نہ تھے۔ بے قابو ہو گئے۔ "دیکھو اس وقت مجھ سے بات نہ کرو۔ ورنہ خدا جانے میں کیا کر بیٹھوں گا۔"

چچی جل کر بولیں "اب اَور کیا کرو گے۔ گھر کی

عزت خاک میں ملا دی۔ محلے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ابھی کچھ اَور کرنے کے ارمان باقی ہیں؟"

چچا سے جواب بن نہ پڑا۔ "عزت تھی تو ہماری تھی تمہاری نہ تھی۔ تمہیں کیا!"

چچی بولیں۔ "یہ عمر ہونے کو آئی۔ بچوں کے باپ بن گئے اور بے عزت ہوتے شرم نہیں آتی۔"

اس کے جواب میں چچا نے گھر اور بچوں کے متعلق بعض اس قسم کے نامناسب الفاظ دہن مبارک سے نکالے جنہیں بیان کرنے سے مَیں قاصر ہوں۔

غرض یہ کہ محلے کے جھگڑے کی آواز گھر میں آ رہی تھی اور گھر کے جھگڑے کی آواز محلے میں پہنچ رہی تھی۔ ما بخیر شما بسلامت۔

# چچا چھکّن نے ردّی نکالی

پچھلے جمعہ کا ذکر ہے۔ تیسرے پہر بچوں کا استاد انہیں پڑھانے کے لئے آیا۔ تو اس نے مودے کے ہاتھ اندر چچی کو کہلا کر بھیجا۔ کہ مردانے میں بچوں کے پڑھنے کے لئے کسی کمرے کا انتظام کر دیجئے۔ وہاں ان کے لکھنے پڑھنے کا سامان بھی ٹھکانے سے رکھا رہے گا۔ اور وہ توجہ سے اپنا کام بھی کر سکیں گے۔ آج کل آدھا آدھا گھنٹہ تو کتابیں کاپیاں تلاش کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ پھر ڈیوڑھی میں بیٹھ کر پڑھاتا ہوں۔ تو بچوں کا دھیان گلی میں رہتا ہے۔ پڑھائی خاک نہیں ہوتی۔

چچی دالان میں بیٹھی ننّو کی اوڑھنی میں پچکا ٹانک رہی تھیں۔ چچا چھکن چارپائی کے کھٹمل مارنے کی غرض سے صحن میں کھڑے پایوں کی چولوں میں اُبلتا پانی ڈلوا رہے تھے۔ اور غالباً اس اندیشے سے کہ کہیں اس کارنامہ کی داد اُن کے نکتہ آفریں دماغ کی بجائے بندو کی خدمت گزاری کے کھاتے میں نہ چلی جائے، چچی کو بار بار توجہ بھی دلاتے جاتے تھے۔ کہ یہ بڑا نایاب اور مجرب نسخہ ہے۔ اور جب کبھی آزمایا تیر بہدف پایا۔ اور پھر لطف یہ کہ بغیر ادویات کے نسخہ۔ یعنی صرف پانی۔ سادہ پانی اتنی بات البتہ کہ کھولتا ہوا۔ گویا تل اوٹ پہاڑ کہنا چاہیئے۔

اس عالمانہ ادعا کا جو جواب چچی کی زبان تک آتا۔ اس میں انہیں تنگ دلی جھلکتی نظر آتی تھی۔ چنانچہ دل ہی دل میں کھچی ہوئی بیٹھی تھیں۔ بندو نے آکر استاد کا پیغام سنایا۔ تو بھڑک اُٹھیں۔ "میرے پاس کوئی کمرہ نہیں۔ جن کا گھر ہے۔ جنہوں نے خالی کمروں میں قفل

ڈال رکھے ہیں۔ ان سے کہیں"۔

چچا نے پیغام تو سنا نہ تھا۔ جواب سن کر چونکے۔ "کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟" بندو لوٹا لیئے پانی چول میں ڈال رہا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ لوٹے کی ٹونٹی اوپر کر دی۔ کہ کہیں عدم توجہی کے دوران میں کھٹمل حرام موت نہ مرتے رہیں۔

مودے نے استاد کا پیغام دہرا دیا۔ سن کر بولے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ ارے بھئی یہی چاہتی ہو ناکہ باہر کا کاغذات والا کمرہ خالی کر دیا جائے؟ تو سیدھے سبھاؤ یہ بات کہہ دیتیں۔ اس میں بھلا بگڑنے کا کون سا موقع ہے۔ آج ہی لو۔ ابھی لو۔ خالی ہوا جاتا ہے کمرہ"۔

چچی کو بھی اپنا بگڑنا بے محل نظر آنے لگا۔ مصالحانہ انداز میں بولیں "کمرہ خالی کرنے کو کون کہتا ہے۔ پچھلے اتوار ہی میں نے صفائی کرا کے اس میں فرش بچھوایا ہے۔ کاغذات الماریوں میں رکھے ہیں۔ انہیں بھی میں نے

جھاڑ پونچھ کر اوپر اوپر سے ٹھیک کر دیا تھا۔ اگر کمرہ کھول کر قفل الماریوں میں ڈال دئے جائیں۔ تو کمرہ بخوبی کام میں آسکتا ہے"۔

ادھورے کام آپ جانئے۔ چچا کے سلیقہ کو ہمیشہ سے ناگوار ہیں۔ بولے" اور اگر اسی بہانے الماری میں سے ردّی کاغذ نکل جائیں۔ اور جو چیدہ چیدہ ضروری کاغذات بچیں۔ انہیں سنبھال کر سلیقہ سے رکھ دیا جائے۔ تو کچھ مضائقہ ہے؟"

چچی کا خیال نتائج کی طرف جانے کا عادی ہو چکا ہے۔ یہ قصہ سن سراسیمہ سی ہو گئیں۔ دبی زبان سے بولیں" بچوں کو پڑھنے کے لئے جگہ ہی کتنی چاہئے ہے؟ ایک میز اور دو کرسیوں کے لئے کمرے کا ایک کونا بھی مل جائے تو بہت ہے"۔

جواب میں چچا کو اپنی نفاست طبع کے اظہار کا موقع نظر آیا۔" جگہ تو یوں غسل خانہ میں بھی موجود ہے۔ وہاں پڑھنے کو کیوں نہیں کہہ دیتیں؟ بس یہ بات ہے ہندوستانیوں

کی۔ جس کی وجہ سے ان کا گھر انگریزوں کی کوٹھیوں سے مختلف معلوم ہونے لگتا ہے۔ ہم لوگوں میں صفائی اور سلیقہ نہیں۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ نشتم پشتم بس گذر ہو جائے" تنگ آ کر چچی کو کھلے لفظوں میں انجام کی طرف توجہ دلانی پڑی۔" اور اگر کاغذ سارے کمرے میں پھیل گئے اور بیٹھنے کو بھی جگہ نہ رہی۔ تو؟"

یہ بات چچا کی سمجھ میں نہ آئی۔" کاغذ پھیل گئے! یہ کیا بات ہوئی؟ ردی نکلنے سے کاغذ پھیلیں گے یا سکڑیں گے؟"

اب اس کا جواب چچی کیا دیں۔ کھج کر مودے سے مخاطب ہو گئیں۔" جا کر کہہ دے کوئی کمرہ خالی نہیں"۔

چچا حیرت کے عالم میں تھے۔" ارے بھئی کیوں خالی نہیں۔ یعنی بات کیا ہے؟ . . . جواب نہیں دیتیں؟ میں کہتا جو ہوں کہ شام تک کمرہ خالی ہو جائے گا۔ آج استاد نے کہا ہے۔ کل شوق سے کمرے میں بیٹھ کر پڑھائے اور پھر میں تمہیں کوئی کام کرنے کو تھوڑا ہی کہتا ہوں

تم تو بس اتنا کرو۔ کہ میرے پاس کسی کو آنے نہ دو۔ میں کاغذات دیکھ رہا ہوں۔ اور کوئی میرے پاس آئے۔ تو میرا دم الجھنے لگتا ہے"۔

چچی نے جل کر کہا "تم جاؤ تمہارا کام" اُٹھنے کے لئے اپنی سلائی کی چیزیں سنبھالنے لگیں۔ چچا نے بقیہ کھٹملوں کی جاں بخشی کا حکم صادر فرمایا۔ کنجیوں کا گچھا سنبھال کمرے کو روانہ ہو گئے۔

کمرہ کھول ناک کی سیدھ الماریوں کا رُخ کیا۔ کواڑ کھولے۔ تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ اوپر سے نیچے تک تمام خانے بے ترتیب کاغذوں سے ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے ہیں۔ عرصہ سے الماریاں کھول کر نہ دیکھی تھیں۔ کاغذوں کی تعداد اور حالت ذہن سے اتر گئی تھی۔ اب جو ان پر نظر ڈالی تو دل رُک گیا۔ کبھی خانوں کو دیکھتے۔ کبھی منہ بسُورا کر کے ڈاڑھی کھجانے لگتے۔ کاغذوں سے گتھ جانے کا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ چچی نے جو صلاح دی تھی۔ کہ کمرہ کھول کر قفل الماریوں میں ڈال دئے جائیں۔ اب بڑی بامعنی

معلوم ہو رہی تھی۔ مگر آپ جانیئے چچا بات کے پورے واقع ہوئے ہیں۔ چچی سے سوال و جواب ہو چکنے کے بعد بھلا یہ کہاں ممکن تھا۔ کہ اب ان کے کہے پر عمل کر کے اپنے وقار کو ٹھیس پہنچانا گوارا کر لیں۔ خانوں پر نظر ڈال کر دل کو حوصلہ دلانے کی کوشش فرمائی۔ "تو گویا ردی کاغذات نکالنے ہیں الماریوں سے ... سمجھے صاحب ... ردی کاغذات ... بلکہ یوں کہیئے۔ کہ کام کے کاغذات الگ کر کے رکھ دینے ہیں ... ہوں گے ہی کتنے۔ معمولی بات ہے۔ تم بسم اللہ کر دو بے یار"۔

لیجئے صاحب چچا میاں پل پڑے۔ کاغذات کے ڈھیر الماریوں میں سے نکالنے اور فرش پر چننے شروع کر دئے۔ دو الماریوں کی بساط ہی کیا ہوتی ہے۔ ذرا سی دیر میں خالی ہو گئیں۔ لیکن کاغذوں کے ڈھیروں سے کمرہ سارا بھر گیا۔ کمرہ کی یہ کیفیت دیکھ کر چچا کے دماغ میں ایک نئی کھڑکی کھلی۔ بڑی عقیدت

اور داد کی نظروں سے الماری کے خانوں کو تکنے لگے۔ پہلی بار یہ حقیقت منکشف ہو رہی تھی۔ کہ اللہ میاں نے الماری بھی کیا نعمت بنائی ہے۔ جو بے شمار چیزوں کو محض اِس وجہ سے اپنے اندر کھپا لیتی ہے۔ کہ وہ اس میں اوپر نیچے رکھی جاتی ہیں ؞

کاغذات کے اس دسترخوان پر پا انداز کے قریب چچا آلتی پالتی مار بیٹھ گئے۔ جو ڈھیر سامنے تھا اس کے کاغذات ملاحظہ فرمانے شروع کر دئے۔ طرح طرح کے کاغذات تھے۔ خطوط۔ بل۔ نسخے۔ نامکمل غزلیں۔ مسودے۔ دعوتی رقعے۔ اخباروں کی کترنیں۔ انگریزی اخباروں کی تصاویر کے ورق۔ دکانداروں کے اشتہار۔ منی آرڈروں کی رسیدیں۔ عید کارڈ۔ حساب کے پرزے اور اللہ جانے کیا کیا۔ ایک ہاتھ کام کے کاغذوں کی جگہ مقرر کر لی۔ دوسرے ہاتھ ردّی کاغذوں کی۔ دل ٹھکانے لگا۔ ڈھیر کی تقسیم شروع کر دی ؞

ایک ایک کاغذ کو اٹھا کر غور سے دیکھتے۔ کسی کو

اِس ہاتھ رکھ لیتے۔ کسی کو اُس ہاتھ۔ بعض کاغذات کے
لئے دونوں ڈھیر اپنے اپنے حق پر کھینچا تانی کرتے۔
چچا کا ہاتھ بے بسی کے عالم میں کبھی ایک ڈھیر کی طرف
بڑھتا۔ کبھی دوسرے کی طرف۔ بعض کاغذ اپنی باری
ختم ہونے کے بہت دیر بعد اپنا حق ثابت کرنے میں
کامیاب ہوتے۔ ایک ڈھیر میں دب چلنے کے بعد
نکل کر دوسرے ڈھیر میں پہنچتے۔ غرض یہ کہ بڑے انہماک
کے ساتھ یہ کام شروع ہو گیا تھا۔ رات تک ردی الگ
کرنی تھی۔ اگلے دن کمرہ بچوں کے استعمال کو دے دینے
کا وعدہ تھا۔ کام بھی لمبا چوڑا تھا۔ پھر بے اختیاری میں
جو باتیں چچی سے کہہ بیٹھے تھے۔ ان کی پچ بھی تھی۔ بڑی
سرگرمی سے بانٹ کے دھندے میں جتے ہوئے تھے
اور بڑی پھرتی سے ہر کاغذ سے نپٹتے چلے جا رہے تھے
آدھ گھنٹے تک تو یہ عمل چپ چپاتے بڑی تن دہی
سے جاری رہا۔ کاغذوں کے کئی ڈھیر دو دو حصوں
میں تقسیم ہوتے چلے گئے۔ لیکن اس کے بعد جب چچا

نے ایک بار سر اٹھا کر ردّی اور کام کے کاغذوں کا جائزہ لیا۔ تو خیال آیا۔ کہ ردّی توقع سے بہت زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ردّی کو غور کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ گویا اس سے پوچھ رہے تھے۔ کہ تو اتنی زیادہ کیوں نکل آئی۔ اور ہم نے تجھے اتنی زیادہ مقداریں آخر رکھا کیوں تھا؟ اندیشہ پیدا ہوا۔ کہ صفائی کے جوش میں کہیں کارآمد کاغذات تو اس ڈھیر کی نذر نہیں ہوتے جا رہے۔ اوپر ہی کسی دکان کا گھی کا اشتہار پڑا تھا۔ اسے دیکھتے دیکھتے خیال آیا۔ کہ پچھلے دنوں چھمّن خاں کہہ رہے تھے کہ دیہات سے گھی منگانے کا بندوبست کر کے شہر میں خالص گھی کی دکان کھولنا چاہتے ہیں۔ بالفرض انہوں نے دکان کھول لی۔ تو اس کے متعلق اشتہار بھی ضرور تقسیم کریں گے۔ اور اشتہار لکھوانے کے لئے ہمارے سوا آخر کس کے پاس جائیں گے۔ ایسی حالت میں ہم معنی مضمون کا ایک اشتہار پیش نظر ہونا بڑا نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔

یہ خیال آتے ہی اس اشتہار کو اٹھا کر کام کے
کاغذات میں رکھ لیا اور مناسب معلوم ہوا ۔ کہ ردّی
کاغذات پر خوب سوچ سمجھ کر ایک نظر غور کی پھر ڈال
لی جائے ۔ اب جو ان کاغذات کو غور سے ملاحظہ فرمایا
تو معلوم ہوا ۔ کہ صفائی کی رَو میں بڑی بڑی نایاب چیزیں
ردّی کرتے چلے گئے ہیں ۔ مُنّے خاں درزی کا بل ردّی
کر ڈالنا آخر کیا معنی ؟ کچھ نہیں تو چار دن کی بحث کے
بعد اس سے بنڈی کی سلائی طے ہوئی تھی ۔ کل نئی بنڈی
سلوانے پر اگر وہ اسی قسم کی بحث پھر کھڑی کر دے
تو ؟ سند کے طور پر بل اپنے پاس ہو ۔ تو کس قدر وقت مفید
کاموں کے لئے بچایا جا سکتا ہے ۔ مسینا کا حساب
کر کے اس سے لے باقی کی جو رسید لی تھی ۔ بوقت ضرورت
وہ بھی بڑی کار آمد ثابت ہو سکتی ہے ۔ ان گھوسیوں کا
بھلا کیا اعتبار ۔ اگر کل کو کہے ۔ کہ میرا حساب تو گئے برس
سے چلا آ رہا ہے ۔ تو صاحب من رسید کے بغیر بھلا کیونکر
ثابت ہو جائے گا ۔ کہ سسرا جھوٹ بکتا ہے ۔ آئے

ہوئے عید کارڈ اپنے اشعار کی وجہ سے بہت ہی نفع بخش ثابت ہوسکتے ہیں۔ مثلاً اگر عید کے موقع پر یہی اشعار سادہ کاغذ پر نقل کر کے بھیج دئے جائیں۔ تو مزاج کی سادگی بھی ظاہر ہو۔ اور کفایت بھی رہے۔ ہم خرما وہم ثواب اخبار کی کترنیں شوق سے کاٹ کر رکھی تھیں۔ تو ان میں قطعاً کوئی قول قابل قدر اور قابل عمل نظر آیا ہوگا۔ تصاویر کے مصرف تو اظہر من الشمس ہیں۔ بچوں کا دل بہلایا جاسکتا ہے۔ چوکھٹوں میں لگوائی جاسکتی ہیں۔ تحفہ کے طور پر دی جاسکتی ہیں۔ اور پرانے اخبار بھی اگر غور کیا جائے تو بڑے کام کی چیز ہیں۔ مثلاً صندوقوں اور الماریوں میں بچھائے جاسکتے ہیں۔ اور برسات کے دنوں میں ان سے بچوں کے لئے ناؤ بنانے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ یعنی بچوں کا ایک ذرا سا شوق پورا کرنے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔ کہ ایک تازہ اخبار اٹھا کر ضائع کر دیا جائے۔ غرض یہ کہ پہلے آدھ گھنٹے میں جس قدر کاغذ ردی قرار پائے تھے۔ اگلے آدھ گھنٹے

میں تقریباً سب کے سب کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر کارآمد قرار پا گئے۔ ایک گھنٹے کی محنت کے نتائج پر غور کیا۔ تو چچا کو اپنے مزاج میں ایک قسم کی تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ یعنی ان کی طبیعت ان کے عزم سے عدم تعاون کرنے پر آمادہ معلوم ہوتی تھی۔ جسم بھی سرکشی پر تل چکا تھا۔ جمائیاں اور انگڑائیاں چلی آ رہی تھیں۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے سیدھا کرنے کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ آنکھیں کاغذات کو محض دیکھ رہی تھیں کہ افراتفری میں پڑے ہوئے ہیں۔ دل صرف اتنا کہہ رہا تھا۔ کہ اگر یہ منتخب ہو ہوا کر مرتب ہو جاتے۔ تو بہت ہی خوب ہوتا۔ لیکن ان سے نپٹنے کی امنگ انتقال کر چکی تھی۔ تمام امور پر غور کر کے مناسب معلوم ہو رہا تھا۔ کہ ذرا دیر کو تعطیل تو بہر حال منائی جائے۔ بندو کو آواز دی کہ پان لائے۔ مودے کو حقہ تازہ کر کے لانے کے لئے کہا۔ خود فرش پر دراز ہو گئے۔ دل تفریح کا متلاشی تھا۔ کاغذوں میں اوپر ہی ایک میم کی تصویر رکھی ہوئی

تھی۔ اس کا حسن کبھی چچا کو بھایا ہوگا۔ اس لئے اخبار میں سے پھاڑ کر رکھ لی تھی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اس کو ملاحظہ فرمانے لگے۔ بندو وہاں لایا۔ تو تصویر کی طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا "کیوں بے۔ اس سے کرے گا شادی؟"

بندو نے تصویر لے لی۔ اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ بولا یہ تو میم ہے"۔ نظریں کہہ رہی تھیں۔ کہ تصویر دیکھ کر محظوظ ہوا ہے۔ اتنے میں مودے نے اسے آواز دی کہ بیوی جی بلا رہی ہیں۔ بندو تصویر ہاتھ میں لئے لئے چل پڑا۔ چچا نے فوراً ٹوک کر تصویر رکھوا لی۔ اس کے جانے کے بعد خود اسے غور سے دیکھنے لگے۔ پھر کام کے کاغذات میں رکھ لی۔

دفعتاً خیال آیا۔ کہ جب پہلا ڈھیر تقسیم کرنے بیٹھے تھے۔ تو شروع ہی میں اپنی کبھی کی کہی ہوئی ایک نامکمل غزل نظر سے گزری تھی۔ ذرا دیر اس سے لطف اندوز ہونا نامناسب نہ ہوگا۔ ڈھیر کو الٹ کر سامنے

رکھا۔ اس کے بہت سے کاغذ بکھیر کر غزل ڈھونڈ نکالی۔
ایک محجوبانہ تبسم سے اس کا مطالعہ کرنے لگے۔ مودہ حقہ
لے کر آ رہا تھا۔ اس کے قدموں کی آہٹ معلوم ہوئی۔
تو مطالعہ بلند آواز سے شروع کر دیا۔

خاک پر ہے تن بے جاں میرا
دھیان رکھنا سگ جاناں میرا
قصد صحرا جو کبھی کرتا ہوں
پاؤں پڑتا ہے گریباں میرا

واقعہ یہ تھا۔ کہ مودہ اپنے تنہائی کے اوقات میں
کئی مرتبہ بعض غزلوں کے اشعار گنگناتا ہوا سنا گیا تھا
چچا کو خیال آیا۔ کہ اگر اس کے حافظہ کی بیاض کے لئے
بعض زیادہ خوشگوار اور فن کے اعتبار سے پختہ اشعار
بہم پہنچا دئے جائیں۔ تو اپنے اور اس کے دونوں کے
لئے بوجوہ باعث مسرت ہوگا۔ لیکن بندہ قدرشناس
ثابت نہ ہوا۔ حقہ رکھتے ہی واپس چلا گیا۔ چچا وردِ اشعار
کے دوران میں گردن موڑ موڑ کر باہر دیکھتے رہے۔ کہ ممکن

ہے۔ لحاظ نے دو بدو ہو کر اشعار سننے کی اجازت نہ دی ہو۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب اندر صحن میں سے اس کی آواز سنائی دی تو دل برداشتہ ہو کر بولے "جاہل ہے۔ یا چھٹن کی اماں نے تاکید کر رکھی ہوگی۔ کہ وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرنا"۔

اس کے بعد چچا حقہ کے کش لگاتے ہوئے فلسفہ حیات پر غور کرنے لگے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کاغذوں پر بھی ایک نظر ڈال لیتے تھے۔ تجربہ کر رہے تھے۔ کہ جب کاغذات کو بکھیر کر حقہ پیا شروع کر دیا جائے۔ تو ایسی حالت میں کاغذات کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے۔

اتفاق سے دور کے ایک ڈھیر کے اوپر چچی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک لفافہ نظر پڑا۔ ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا۔ کھول کر دیکھا۔ تو چچا کے نام ان کا خط تھا۔ ۱۹۲۳ء میں ودّو کو نمونیہ ہو گیا تھا۔ ان دنوں چچا کسی کام سے لکھنؤ گئے ہوئے تھے۔ چچی نے بڑی پریشانی کے عالم میں ایک خط لکھ کر جلد واپس آنے کے لئے منت سماجت کر

رکھی تھی۔ چچا نے یہ خط پڑھا۔ تو غالباً چچی کے عجز اور پریشانی کا اعتراف دیکھ کر مناسب معلوم ہؤا۔ کہ گھر میں اپنی اہمیت کا احساس تازہ کرنے کی غرض سے احتیاطاً اسے چچی کو سنا ڈالا جائے۔ چنانچہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جوتی پہنتے پہنتے اندر کا رُخ کیا۔ جا کر چچی سے کہا "چھٹن کی اماں۔ دیکھنا تمہارا ایک خط ملا ۲۳ئہ کا۔ وہ جب ودّو کو نمونیہ ہؤا تھا۔ اور مَیں لکھنؤ تھا۔ کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے"۔

چچی ہنڈیا چولہے کی فکر میں مصروف تھیں۔ بولیں "دور کرو ایسے خط کو۔ مَیں نہیں دیکھتی"۔

چچا کا کام نہ بنا۔ بولے "ایسا بھی کیا وہم۔ مجھے تو اسے پڑھ کر خیال آیا۔ کہ اللہ تعالےٰ نے اس وقت بڑا ہی فضل کیا۔ ورنہ اس بچے کے بچنے کی امید تھوڑا ہی رہی تھی جب ہی تو تم نے گھبرا کر مجھے ایسا خط لکھا تھا کہ ..."

چچی نے کچھ چڑ کر کہا "اب خاک بھی ڈالو اس نحس وقت کی یاد پر"۔

کوشش میں ناکام رہنے سے چچا جل گئے۔ احتیاط رخصت ہو گئی"۔ اب خط سننا بھی گوارا نہیں۔ اور اس وقت کیسے لکھ رہی تھیں۔ خدا کے لئے جلدی آؤ۔ اور ہاتھ جوڑوں خط پڑھتے ہی روانہ ہو جاؤ"۔

چچی شاید اصل مطلب تاڑ گئی تھیں۔ ہلکے سے بولیں "بچے کی ضد جو تھی۔ بچوں کی ضدیں تو ایسی ہی ہوتی ہیں"۔ یہ کہہ کر اٹھیں اور پرات لے باورچی خانہ کی کوٹھڑی کو چل دیں۔

چچا نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اسٹیج خالی ہو چکا تھا۔ الٹے پاؤں روانہ ہو جانے کے سوا چارہ نظر نہ آیا۔

واپس آ کر کچھ دیر کاغذوں کے درمیان فرش کے ایک جزیرے پر کھڑے ہو گئے۔ دماغ خالی تھا۔ دل میں ایک امتلا سا تھا۔ کبھی یک لخت یوں مڑتے گویا کسی کو پکاریں گے۔ پھر غالباً یہ سوچ کر رک جاتے کہ چچی سے کہہ چکے ہیں۔ کسی کو آنے نہ دیں۔ ساتھ ہی یہ بھی سوچتے کہ کوئی آ کر بھی کیا لے گا۔ اکتاہٹ کے

عالم میں کُرتے کے اندر ہاتھ ڈال پیٹ کھجاتے جا رہے تھے۔ یہ شغل کب تک جاری رہ سکتا تھا۔ آخر گھبرا گئے کمرے سے نکل ڈیوڑھی میں چلے آئے۔ سڑک پر آنے جانے والوں کا نظارہ کرنے لگے۔ مگر کمرے کے متعلق دل میں جو پھانس تھی وہ کیونکر نکل سکتی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ یہ بکھیڑا جو پھیلا آئے ہیں۔ اسے اب کس طرح خاطر خواہ طریق پر پیٹیں۔ پچھتا دا بھی تھا۔ کہ تمہیں اس قصے میں پڑنے کے لئے آخر کہا کس نے تھا۔ الجھن بھی تھی۔ کہ چچی کے سامنے سرخرو کیونکر ہوں گے۔ آخر دل میں کچھ طے کر سر ڈالے ہوئے اندر پہنچے۔ جا کر چچی سے کہنے لگے۔ "چھٹن کی اماں۔ وہ کل تم آنولہ کا تیل منگانے کو کہہ رہی تھیں۔ کہو تو اس وقت جا کر لا دوں؟"

چچی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "کمرے کا کام ختم کر لیا؟"

چچا کو سوال کا ایسا کھلا انداز ناگوار تو گزرا۔ تاہم بولے "وہ تو ہو رہا ہے۔ مجھے خیال یہ آیا تھا۔ کہ پھر تیل والے کی دکان نہ بند ہو جائے"۔

چچی نے کہا "تیل کی کیا جلدی ہے۔ کل آجائے گا۔ آج کمرہ ہی ختم کر لو تو بڑی بات ہے"۔

چچا کو اس جواب کے سوا چارہ نظر نہ آیا۔ "ہاں ہاں وہ تو انشاء اللہ ختم ہو گا ہی"۔

چچی بھی ایک حضرت ہیں۔ بولیں "رات کو مردانے میں جا کر دیکھوں گی"۔

چچا جھنجھلا کر باہر نکل آئے۔ کچھ دیر ڈیوڑھی میں پس و پیش کے عالم میں کھڑے سر کھجاتے رہے۔ پھر کھڑے کھڑے ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ فکر مند نظروں سے اِدھر دیکھتے تھے کبھی اُدھر۔ کھسیانے سے ہو گئے تھے۔ آخر اٹھ کھڑے ہوئے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کاغذات کے کمرے میں پہنچے۔ کھسیانے تو ہو ہی رہے تھے جوش میں آکر آٹھ دس ٹھڈے کاغذات کے ڈھیروں کو رسید کئے۔ اور جب سب کاغذ خوب بکھر گئے۔ تو انہیں اٹھا اٹھا کر یوں الماری میں پھینکنے لگے۔ جس طرح مزدور گڑھے میں سے مٹی نکال نکال کر باہر پھینکتے ہیں۔

رات کو چچی مردانے میں آئیں۔ تو دیکھا کہ کمرہ صاف ہے۔ الماریوں میں قفل پڑے ہیں۔ بولیں" اور الماریاں کھول کر اپنی کارگزاری بھی تو دکھاؤ"۔

جواب میں چچا نے کنجیاں تلاش کرنی شروع کر دیں پر نہ معلوم گچھا کہاں رکھ کر بھول گئے تھے۔ اس دن سے آج تک یہ کیفیت ہے۔ کہ دن میں تو چچا کی کنجیوں کا گچھا مل جاتا ہے۔ لیکن رات کے وقت جب چچی مردانے میں آسکتی ہیں۔ باوجود بے حد تلاش کے کبھی دستیاب نہیں ہوا۔

# جس روز چچا چھکن کی عینک کھو گئی تھی

جس روز چچا چھکن کی عینک کھوئے جانے کا حادثہ ہوا اس روز منہ اندھیرے سے وہ بڑے تاؤ میں تھے۔ ایسی حالت میں اگر انہیں جھونجھل اتارنے کا موقع مل جائے جب تو فراغت پاتے ہی ان کا دل ہر قسم کی کدورت سے پاک اور آئینہ کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی اتفاق یا مجبوری سے دل کی بھڑاس نہ نکال سکیں تب البتہ گھنٹوں انہیں کل نہیں پڑتی۔ اور جوش کے ریلے بار بار آ کر ایسا بے دھیان کرتے رہتے ہیں۔ کہ آپ میں نہیں رہتے۔ اس روز غسل کے بعد ایسی ہی بے

دھیانی میں اپنی عینک کھو بیٹھے۔ اس کے کھوئے جانے کا حادثہ سنانے کے لئے صبح کے وہ واقعات معلوم ہونا ضروری ہیں۔ جن کے باعث چچا اس قدر تپ گئے تھے۔

سچ پوچھئے۔ تو اس روز چچا کی تنک مزاجی کا کوئی قصور نہ تھا۔ تابڑ توڑ باتیں ہی ایسی ہوئیں۔ جن پر کسی شریف شخص کو غصہ آئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ آپ خیال فرمایئے چلّے کا جاڑا ہو۔ صبح کے تین بجے کا وقت۔ باہر کہرا پڑ رہا ہو۔ گرم گرم لحاف میں میٹھی نیند خراٹے لے رہی ہو اور کوئی شخص نہایت بے احتیاطی سے دروازے کی کنڈی پیٹ پیٹ کر نیند حرام کر ڈالے۔ اور رسید نہ دیئے جانے پر بھی اپنے اس مذموم فعل سے باز آنے کی ضرورت نہ سمجھے۔ تو خدا لگتی کہئے۔ غصہ آنے کی بات ہے یا نہیں؟

قہر درویش برجان درویش۔ لحاف میں سے باہر نکلنا پڑا۔ کنٹوپ پہنا۔ رضائی اوڑھی۔ کھلے میں سے گزر کر سُو سُو کرتے دروازے پر پہنچے۔ کنڈی کھولی۔ دیکھتے

ہیں۔ تو خاں صاحب کا ملازم + کہ " ابے پاجی تو اس وقت؟"
بولا "خان صاحب کے پیٹ میں درد ہے۔ سینک کے
لئے ربڑ کی تھیلی مانگی ہے" ÷

خاں صاحب تھیلی لینے خود آ گئے ہوتے۔ تو بالکل
جدا بات تھی لیکن ایسے وقت کسی ملازم سے دو چار ہونا
اور آداب و تکلفات کو ملحوظ رکھنا واقعہ یہ ہے۔ کہ بڑی
ٹیڑھی کھیر ہے + چچا نے تھیلی تو لا دی۔ لیکن خاں صاحب
کی صحت اور درد کی وقت شناسی پر ایک مختصر مگر پر مغز
تبصرہ کئے بغیر نہ رہ سکے ÷

ملازم کم بخت کی حماقت دیکھئے۔ کہ تھیلی کے ساتھ
ساتھ آپس کی یہ باتیں بھی خاں صاحب کو جا پہنچائیں!
چچا دوبارہ لیٹنے نہ پائے تھے۔ کہ کنڈی پھر پٹنی شروع
ہو گئی۔ بہت دیر تک انجان بنے رہنے پر بھی گولہ باری
تمام نہ ہوئی۔ تو اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا۔ کہ بعض ناگفتہ
بہ الفاظ کہہ کر دل کا غبار نکالیں۔ اور لحاف پھر اوپر سے
اُلٹ ڈالیں ÷

خون کے سے گھونٹ پیتے ہوئے کنڈی کھولی۔ مگر زبان ابھی کھولنے نہ پائے تھے۔ کہ ملازم نے ترت تھیلی ہاتھ میں تھما دی۔ بولا "خان صاحب نے کہا ہے۔ کہ اسے اپنے پاس انڈے دینے دیجے۔ ہم بوتل سے کام چلا لیں گے۔ اور اب کبھی ہم سے پالش کی شیشی منگا کر دیکھئے گا"۔

سردیوں میں اندھیرے منہ بستر سے باہر نکلوانا۔ اور نوکر کے ہاتھ اخلاق سے ایسی گری ہوئی بات کہلوا کر بھیجنا۔ ایمان ایمان سے کہئے۔ بھلا شرافت ہے؟ مارے غصّے کے چچا کی نیند حرام ہو گئی۔ لیٹے تو۔ مگر تمام وقت بڑبڑاتے ہوئے کروٹیں بدلتے رہے" جیسے ان کے باپ کی میراث میں مجھے ربڑ کی تھیلی ملی تھی . . . اور مزاج تو دیکھو۔ کہ اپنے ہی پاس انڈے دینے دیجے . . . مرغی کا . . . دھمکی دیتا ہے۔ کہ پالش منگا کر دیکھئے گا . . . جیسے شہر بھر میں یہی تو ایک موچی رہ گیا ہے"۔

کسی کروٹ نیند نہ آئی۔ تو تنگ آ کر سونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اُجالا ہونے تک حقّے سے غم غلط کرنے کی

ٹھانی۔ نوکر چاکر سو رہے تھے۔ چلم لے خود باورچی خانے کا رُخ کیا۔ غصّہ اسی طرح دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔" آخر گھر ہے۔ کوئی خیراتی ہسپتال تو ہے نہیں۔ کہ جس وقت جس کا جی چاہا۔ سوتوں کو بے آرام کیا اور رزبڑ کی تھیلی طلب کر لی۔ چندہ کی تھیلی ہے۔ جو یہ بدمزاج۔ کہ اپنے ہی پاس انڈے دیئے دیجے؟"

باورچی خانے میں جا کر دیکھتے ہیں۔ تو اتفاق سے چولہا ٹھنڈا! نہ جانے چچی رات کو بھوبل میں لکڑی دبانا بھول گئی تھیں۔ یا دبی ہوئی لکڑی جل کر راکھ بن چکی تھی۔ چچا کا غصّہ اور بھڑک اٹھا" گھر داری کرنے چلی ہیں۔ آگ تک کا انتظام ٹھیک رکھنے کی توفیق نہیں۔ اور پھر ہر وقت کی ضد کہ میں یہ کرتی ہوں۔ میں وہ کرتی ہوں میں کام سے مری جاتی ہوں۔ حالت یہ ہے۔ کہ گھر میں پالش تک منگا کر رکھنے کا ہوش نہیں۔ ضرورت ہو۔ تو ہمسایوں کے ہاں سے پالش منگایا جاتا ہے۔ اور اس کم ظرف کو دیکھو۔ کہ پالش کیا دے دی۔ گویا حاتم کی

گور پر لات ماردی . . . جو برابر پالش لے لی۔ تو بدلے میں رٹر کی تھیلی انہیں بخش دو . . . کمبخت کہیں کا۔
چچا بکتے جھکتے اٹھ کھڑے ہوئے، اندر چلے۔ صحن میں پہنچ کر خیال آیا۔ کہ حقے کے بغیر صبح کرنا محال ہے۔ خود ہی آگ سلگانی چاہیئے۔ واپس ہو گئے، دو قدم نہ چلنے پائے تھے۔ کہ پھر لوٹنے کی ٹھان لی۔ پھونکیں مارنے کی زحمت کا خیال آ گیا تھا، مگر دالان میں پہنچنے کے بعد طلب نے ایسا بے بس کر دیا۔ کہ باورچی خانے میں پہنچے۔ اور آگ سلگانے ہی کی ٹھیرائی، بڑبڑاتے ہوئے اِدھر اُدھر سے کاغذ چھپٹیاں۔ رسّی کے ٹکڑے جمع کیئے۔ ان پر کوئلے رکھ کر دیا سلائی دکھائی۔ اور پھونکیں مار مار کر اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑ پھوڑ کر آدھ گھنٹے کی محنت سے کہیں کوئلے دہکائے لیکن اب آپ چلم بھرنے کے لئے تمباکو کے ڈبّے کو جو دیکھتے ہیں۔ تو خالی! ڈبّا اٹھا کر زمین پر دے ٹپخا! دیکھی اس کی حرکت! جی میں آتا ہے۔ حرام خور کا قیمہ کر کے رکھ دوں۔ ہزار تاکید کرو۔ پر ان نوکروں کے کان

پر جوں نہیں رینگتی۔ اور اس بدمعاش کو دیکھو۔ صبح صبح پرائیویٹ بات جا کر خاں صاحب سے بیان کر ڈالی۔ کوئی اس پاجی سے پوچھے۔ میں نے خاں صاحب کے خیراتی ہسپتال میں داخل ہو جانے کی بات اس سے کہی تھی۔ کہ جا کر ان کے سامنے بیان کر دے؟ تجھے ربڑ کی تھیلی دی ہے۔ تو چپ چاپ جا کر ان کے حوالے کر دے۔ تجھے دوسروں کے قصّوں سے کیا سروکار؟ اور پھر ان نواب صاحب کا مزاج کہ فرماتے ہیں۔ تھیلی کو اپنے ہی پاس انڈے دینے دیجئے"۔

تھیلی کے انڈے یاد آ جانے سے غصّے کا ایک نیا ریلا آیا۔ جل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہاں پہنچے۔ جہاں بندو سو رہا تھا۔ سوتے ہوئے کے ایک ٹھڈا رسید کیا۔ اور برس پڑے۔

"حرام خور۔ بدمعاش۔ ہزار دفعہ نہیں کہا۔ کہ ایک چلم کا تمباکو باقی رہے۔ تو اور تمباکو فوراً لے آیا کر۔ مگر لاتوں کے بھوت بھلا باتوں سے مانتے ہیں؟"

بندو ہائے واتے اور میاں جی میاں جی کرتا ہوا

اٹھ بیٹھا۔ چچی بھی جاگ گئیں۔ جوتی پہنتی پہنتی لپک کر چچا کے پاس پہنچیں۔ "کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کیوں صبح صبح غریب پر برس پڑے؟" آگ کے سلسلے میں چچی پر بھی غصہ تھا۔ چچا غصے سے گردن موڑ کر بولے۔ "بس۔ اس معاملے میں میری رائے محفوظ رہنے دو۔"

بندو بسورتا ہوا بولا "رکھا تو ہوا ہے تمباکو۔"

چچا نے اسے زیادہ نہ بولنے دیا۔ "تو ہم اندھے ہیں؟"

چچی نے پھر دخل دیا۔ "رات ہی تو اس نے تمباکو کے لئے مجھ سے چار پیسے لئے ہیں۔"

چچا نے چچی کو کچھ جواب نہ دیا۔ جھک کر بندو کا کان پکڑا۔ اور اسے کھڑا کر لیا۔ "دکھا چل کر کہاں ہے تمباکو تمباکو کے نام سے پیسے لے لے کر ریوڑیاں اڑتی ہیں بدمعاش۔ رات کھا نہیں رہا تھا ریوڑیاں؟ اسی وقت پیدا نہ کیا تمباکو۔ تو میرے ہاتھوں جیتا نہ بچے گا۔"

بندو نے باورچی خانے میں پہنچ کر طاق میں سے

تمباکو کا ڈبّا نکال چچا کے ہاتھ میں تھما دیا! چچا منٹ بھر ڈبّے کو ہاتھ میں لئے چپ چاپ دیکھتے رہے۔ تمباکو سے بھرا ہوا تھا۔ پھر گویا اپنی اس خاموشی کی کسر نکالنے کی غرض سے ایک تھپّڑ اور بندو کے رسید کیا۔ "ابے طاق میں تمباکو۔ تمباکو رکھنے کی جگہ طاق ہے؟ دکان ہی میں نہ رکھ آیا حرام خور۔ یہ جگہ ہوتی ہے تمباکو رکھنے کی؟"

بندو آنسو پونچھتے ہوئے بولا "بیوی جی نے کہا تھا"

چچا کھسیانے ہوکر اور گرجنے لگے۔ "ابے بیوی جی کے بچّے۔ تجھے خود خیال نہ آیا۔ کہ ضرورت ہوگی۔ تو طاق میں کہاں تلاش کرتے پھریں گے"؟

بندو نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ "نیچے بلّیاں گرا دیتی تھیں" *

مگر چچا کی دلیلیں کہاں ختم ہوتی ہیں۔ "بلیاں گرا دیتی تھیں۔ باتیں سنو بدمعاش کی۔ تمباکو نہ ہوا دودھ ہوگیا۔ کہ بلیاں گرا دیتی تھیں" *

چچی دالان میں آکھڑی ہوئی تھیں۔ غصّے کو دبا کر

بولیں" ہو چکی تفتیش؟"

چچا سر جھکائے جز بز واپس آرہے تھے۔ جھنجھلا کر بولے" تمہاری ہی شہ نے نوکروں کو سر پر چڑھا دیا ہے" "کہ تمباکو کا ڈبّا طاق میں رکھنے لگے ہیں؟"

" ہمیں کیونکہ معلوم ہو سکتا تھا۔ کہ ڈبّا طاق میں رکھا ہے؟"

"عقل سے کام لے کر"۔

چچا نے کچھ کہنا چاہا۔ بات کہنے کے لئے دو بار سینے میں سانس بھرا۔ مگر پھر صرف "ناقص العقل" کہنے پر ہی اکتفا کیا اور جلدی سے باہر نکل گئے۔

بس یہ واقعات تھے۔ جن کی وجہ سے چچا اس روز تاؤ میں آگئے تھے۔ ربڑ کی تھیلی کا قصہ۔ آگ نہ ہونا۔ تمباکو طاق میں سے نکل آنا۔ بندو کو بیٹنا۔ چچی سے جھڑپ۔ یہ سب ایسی باتیں نہ تھیں۔ جو دماغی توازن پر اثر ڈالے بغیر رہ سکتیں۔ صبح سے جو دیوان خانے میں گھسے۔ تو گھنٹوں باہر نکلنے کا نام نہ لیا۔ دوپہر چچی نے چائے تیار ہونے کی اطلاع بھجوائی

تو امامی کو ہاں ناں کچھ جواب نہ دیا۔ گم سم کھڑے سامنے گھورتے رہے۔ راہ دیکھ دیکھ کر چچی نے چائے کمرے میں بھجوا دی۔ آپ نے لوٹا دی۔ ساتھ کہلا بھیجا۔" اسے بھی طاق میں رکھ دیں"۔

بس دیوان خانے میں ٹہلے جا رہے تھے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بول بھی رہے تھے۔ کبھی کبھی ہاتھ اور سر ایسے شد و مد سے ہلانے لگتے۔ جیسے پنچوں کے سامنے اپنے طلاق کے دعوے کی وجوہ بیان کر رہے ہیں۔ اور اپنی وجوہ کی قوت و صداقت پر مصر ہیں۔ "نوکروں کے سامنے کیا۔ ہمسایوں تک میں مجھے رسوا کر ڈالا ہے۔ ورنہ اس پٹھان کی طاقت تھی۔ کہ پالش کا طعنہ دے جاتا . . . آخر کوئی حد بھی . . . بس ہو چکی . . . اب نہیں . . . ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ مگر انکار . . . جب دیکھو نوکروں کی طرف داری۔ جب دیکھو نوکروں کی طرفداری . . . زندگی اجیرن کر ڈالی ہے . . . آیا تھا طاق! . . . طاق کا بچہ . . . طاق میں پالش کی شیشی منگا کر

نہ رکھی گئی . . . . شیشی ہوتی۔ تو میں کیوں منگوا تا اس بھڑوے سے پالش؟ میری عقل ماری گئی تھی . . . جو برا بر پالش لے کر ربڑ کی تھیلی انہیں دے ڈالو . . . ہیں تو بڑے چترا . . . . "

سورج سر پہ آگیا۔ تو نہ جانے بھوک اور حقے کی طلب سے بے چین ہو کر یا ویسے ہی اکتا کر آپ نے یک بخت باہر جانے کی ٹھیرالی۔ مگر اب تک غسل نہ کیا تھا۔ غسل خانہ اندر تھا۔ اندر کیونکر جائیں؟ دو ایک بار شیشوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ کہ اندر کیا صورت حالات ہے اور چچی کیا کر رہی ہیں۔ صد افسوس کہ وہ مغموم و متفکر نظر نہ آرہی تھیں + یا ورچی خانے کے دھندوں نے انہیں گھیر لیا تھا + چچا چڑھ کر دروازے کے پاس سے پلٹ آئے۔ کچھ دیر گم سُم کھڑے رہے۔ پھر نیت باندھ نہایت بے تعلقی کے انداز سے اندر آئے۔ اور ناک کی سیدھ میں غسل خانے کی طرف چلے۔ چاہتے تھے۔ بغیر کسی کو نظر پڑے غسل خانے میں گھس جائیں۔ اور غسل کے بعد کپڑے بدل

کر چپ چپاتے ہمیشہ کے لئے بنّے میاں کے ہاں چلے جائیں اور کوئی ہزار بلائے۔ لاکھ منّت سماجت کرے۔ ہرگز ہرگز واپس نہ آئیں۔ لیکن حادثاتِ زندگی . . . سب کی نظر سے بچ کر غسل خانے تک تو پہنچ گئے۔ مگر داخل ہونے لگے۔ تو سر نے دروازے سے ٹکر کھا کر بتایا۔ کہ چٹخنی لگی ہوئی ہے۔ اُدھر اندر سے ودّو للکارا "نہیں مانے گا چھٹن میں اماں سے جا کر کہہ دوں گا۔ چھٹن مجھے نہانے نہیں دیتا۔"

چھٹن دیر سے غسل خانے کا دروازہ کھٹاکھٹا کھٹکھٹا کر ودّو کو ستا رہا تھا۔ ودّو نے اس کے دھوکے میں اندر سے چچا کو ڈپٹ دیا۔ اس پر چھٹن کی تو ہنستے ہنستے بُری حالت ہو گئی۔ چچا نے سر سہلاتے ہوئے غصّے سے چھٹن کو دیکھا وہ ہنسی کے مارے دُہرا ہوتا ہُوا صحن کی طرف بھاگا۔ اِدھر چوٹ کی تکلیف اور خفّت اُدھر اپنے گھر میں آنے کا ایسا نامناسب طریق پر اعلان۔ چچا غصّے میں چھٹن کی طرف لپکے۔ وہ دوڑ کر چچی سے جا لپٹا۔ چچی ہنڈیا میں پیاز کڑکڑا

رہی تھیں۔ انہوں نے مڑ کر چچا کو دیکھا۔ اب کیا ہو؟ ملزم سرحد پار ہو چکا تھا۔ چچا غصّے میں لال پیلے ہوتے ہوئے خاموش واپس ہو گئے۔ واپس آ کر دھما دھم غسل خانے کا دروازہ پیٹنا شروع کیا" نکل باہر۔ ۔ ۔ ابھی نکل۔ ۔ ۔ کہ جو دیا کہ ابھی نکل۔ جیسا ہے ویسا ہی نکل۔ ۔ ۔ آتا ہے یا بتاؤں ہیں؟ ۔ ۔ ۔ صابن ہے تو ہُوا کرے۔ ۔ ۔"

ددّو صابن منہ پر ملے۔ تولیہ لپیٹ باہر نکل آیا۔ چچا نے ایک چانٹا اس کے رسید کیا۔" پاجی کہیں کا۔ نکل ہی نہیں چکتا تھا۔ ابے کہا جو تھا ہم نے۔ جیسا ہے ویسا ہی نکل آ۔ نخرا ئے چلا جاتا تھا"۔

ایک چانٹا اَور رسید کر کے چچا غسل خانے میں داخل ہو گئے۔ دَن سے دروازہ بند کیا۔ اور کھٹ سے چٹخنی لگائی۔ اندر چچا غسل میں مصروف تھے۔ دروازے پر ددّو کھڑا ریں ریں کر رہا تھا۔ چچی باورچی خانے میں انجان بنی کام میں مصروف تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں غسل خانے کے اندر سے چچا کی آواز سنائی دے جاتی تھی" تو نہیں

ہوگا چپ؟ . . . دیکھ میں کہتا ہوں۔ سرک جا یہاں سے۔ نہیں اچھا نہ ہوگا . . . میں دروازہ کھول کر اتنی لگاؤں گا۔ کہ اماں ربڑ کی تھیلی سے سینک کرتی پھریں گی"۔

تھوڑی دیر بعد چچی چپکی باورچی خانے سے اٹھیں اور ڈوّو کے پاس پہنچیں "کیا ہوا لال؟ کیوں رو رہا ہے؟ آ بیٹا تو میرے پاس آجا"۔

چچا کی للکار بند تھی۔ پانی گرنے کی آواز بھی اندر سے نہ آرہی تھی۔ نہ جانے جسم پر صابن لگانے میں مصروف تھے۔ یا چچی کے الفاظ سننے کو کان کواڑ سے لگا رکھے تھے۔ ڈوّو نے سسکیاں بھرتے ہوئے اپنے بے قصور ہونے کی داستان سنائی۔ چچی اس کی انگلی تھام کر بولیں "چل تو میرے پاس چل۔ ان کے سر پر تو صبح سے بھوت سوار ہے"۔

چچی ڈوّو کو ساتھ لے چل دیں۔ چچی کا یہ فقرہ سن کر اندر چچا چھکن پر نہ جانے کیا گزری۔ لیکن جب غسل سے فارغ ہو کر باہر نکلے۔ تو چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اور انداز سے

جلالی فقیروں کی بے نیازی کا رنگ جھلک رہا تھا۔ گیلے بدن پر میلا پاجامہ پہنے برآمد ہو گئے تھے۔ اصل میں بڑا تولیہ خود ساتھ لے جانا بھول گئے تھے۔ چھوٹا تولیہ باندھ کر ودّو باہر نکل آیا تھا۔ غسل خانے میں سے آواز دے کر تولیہ مانگنا اور اپنی ضرورت مندی کی آواز چچی کے کان تک پہنچانا۔ غالباً حمیّت اور غیرت کو گوارا نہ ہوا تھا سیدھے اس کوٹھڑی میں چلے گئے۔ جہاں کپڑوں کا بکس رکھا رہتا تھا۔

دس منٹ کے بعد چچا کپڑے بدل کر باہر جانے لگے۔ تو عینک کا قصہ درپیش ہو گیا۔ ایک پاؤں دہلیز کے اندر تھا ایک باہر۔ کہ اچانک خیال آیا۔ کہ غسل کے بعد عینک نہیں لگائی۔ عینک لینے غسل خانے میں گئے عینک اتار کر کھڑکی میں رکھنا کچھ کچھ یاد تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اب دیکھا۔ تو موجود نہ تھی۔ طاقوں پر نظر ڈالی۔ ان میں بھی نہ تھی۔ گھڑونچی کو دیکھا۔ فرش اور نالی کا جائزہ لیا۔ کہیں نظر نہ آئی۔ سوچا۔ شاید میلے کپڑوں کے ساتھ

کوٹھری میں چلی گئی + واپس کوٹھری میں پہنچے۔ کپڑے لاکر تخت پر رکھے تھے۔ عینک تخت پر بھی نہ تھی۔ ہر کپڑے کو احتیاط سے جدا کر کے اُٹھایا۔ ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ جھٹکا۔ کہیں بھی نہیں۔ "گئی کہاں!" قوس اور نیم دائرہ بناتے ہوئے کھڑے گھومتے رہے۔ سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ کہ بے توجہی میں کسی اَور جگہ نہ رکھ دی ہو + مایوسی ہوئی + لپکے ہوئے پھر غسل خانے میں پہنچے۔ پھر کھڑکی کو دیکھا۔ کھڑکی کے نیچے نالی تھی۔ اکڑوں بیٹھ کر اس کا معائنہ بھی کر لیا۔ اسے ناکافی سمجھ کر باہر گئے۔ غسل خانے سے سڑک تک ساری نالی دیکھ ڈالی۔ نہ ملی + واپس غسل خانے میں پہنچے۔ گردن گھما گھما کر طاقوں میں نظر ڈالی۔ گھڑونچی کے نیچے دیکھا۔ گھڑے جگہ سے سرکائے کہیں نظر نہ آئی + ذرا دیر پریشانی کے عالم میں کھڑے سر کھجاتے رہے۔ "عجیب تماشا ہے!" لپکے ہوئے پھر کوٹھری میں پہنچے۔ میلے کپڑے باری باری سے اس زور سے جھٹکے کہ عینک کیا۔ سوئی بھی لگی ہوتی۔ تو الگ ہو کر گر پڑتی +

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ!" ایک لخت نیا خیال سوجھا۔ بھاگے ہوئے پھر غسل خانے میں پہنچے۔ لوٹے اٹھا کر دیکھنے سے رہ گئے تھے۔ وہاں بھی کچھ نہ نکلا۔ "آخر ہوئی کیا!" گردن بڑھا کر احتیاطاً ایک نظر لوٹوں کے اندر بھی ڈال لی۔ کہ آپ جانیے خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ اس کی قدرت سے کیا بعید ہے۔ کچھ سراغ نہ ملا۔ ڈاڑھی کھجاتے ہوئے پھر کمرے میں آگئے۔ "یعنی یہ قصہ کیا ہے"؟ ذرا دیر کھوئے کھوئے کھڑے رہے۔ پھر تخت پر بیٹھ گئے۔ سر جھکا کر ایک نظر احتیاطاً تخت کے نیچے بھی ڈال لی۔ اچانک خیال آیا۔ کہ شاید عینک لگا کر غسل خانہ میں گئے ہی نہ تھے۔ وہاں عینک اتار کر رکھنے کا یوں ہی وہم ہے۔ چپکے بیٹھ کر صبح سے اس وقت تک کے واقعات پر غور فرمانے لگے۔ کہ شاید اس طرح کسی موقع پر عینک اتارنا اور کہیں رکھنا یاد آجائے۔ صبح کے پہلے واقعے کے ساتھ ہی خاں صاحب کا خیال آگیا۔ جل کر بے اختیار منہ سے نکلا ہو نہہ "ربڑ کی تھیلی"! اٹھ کھڑے ہوئے۔ سوچا عینک کہیں بستر ہی میں

نہ رہ گئی ہو۔ دالان میں جا کر سارے لپٹے ہوئے بستر پلیٹ کر ڈالے۔ ان میں سے اپنا بستر ڈھونڈ کر نکالا۔ اس کی ایک ایک چیز دیکھی۔ جھٹکی۔ تکیوں میں ٹٹولا۔ عینک کا کچھ سراغ نہ ملا۔ مایوس ہو کر ایک بار پھر غسل خانے میں پہنچے۔ کہ شاید اس دوران میں عینک سیر سپاٹے سے فارغ ہو کر واپس ہو گئی ہو۔ مگر نہیں آئی تھی۔ مجبوراً کوٹھڑی میں تخت پر کھوئے کھوئے جا بیٹھے۔ "یعنی حد ہو گئی"۔ یک لخت دیوان خانہ میں دیکھنے کا خیال آیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتے وہاں پہنچے۔ میزیں۔ کرسیاں۔ فرش۔ طاق۔ ایک ایک چیز دیکھ لی۔ عینک کہیں ہو تو ملے۔ چچا کھسیانے سے ہو چلے! "کیا واہیات ہے"! بے اختیار جی چاہتا تھا۔ نوکروں اور بچوں کو امداد کے لئے پکاریں۔ لیکن حالات اجازت نہ دیتے تھے۔ چچی سے نوک جھونک ہونے کے بعد نوکر اور بچے چچی کی رعایا معلوم ہونے لگتے تھے۔ ان سے امداد طلب کرنے میں ہیٹی ہوتی تھی۔ پریشانی کے عالم میں یوسف بے کارواں بنے پھر رہے تھے۔ دماغ ایک ہی ادھیڑ بن

میں مصروف تھا۔ کہ اُدھر کس جگہ گئے تھے۔ ممکن ہے عینک وہاں چھوڑ آئے ہوں۔ اچانک باورچی خانے کی یاد آئی وہ طاق والا واقعہ۔ بندوکی حماقت۔ چچی کا نامناسب رویّہ دل نے کہا۔ عینک ضرور باورچی خانے میں ہے۔ آگ سلگاتے ہوئے اتار کر رکھ دی۔ اٹھانے کا خیال نہ رہا۔ ایک چور نظر چچی پر ڈالی۔ وہ ہنڈیا میں کفگیر چلا رہی تھیں "یہ ایسی چپ چپ اور انجان سی کیوں بنی بیٹھی ہیں! گویا کوئی بات ہی نہیں۔ اس طرف نظر نہیں اُٹھاتی! چہرے پر کیا پارسائی اور شہیدپن برس رہا ہے"۔ یک لخت معما حل ہوگیا "بھٹیارہ ہے نمازی تو ضرور ہے دغابازی چھپا رکھی ہے عینک۔ جبھی تو بے نیازی کا یہ عالم ہے۔ کہ آخر ہار جھک مار کر مانگنے آئے گا"۔ چچا جل کر اندر چلے گئے۔ کواڑ کے شیشوں میں سے زیادہ غور سے چچی کو دیکھنا شروع کیا۔ چچی نے اتفاق سے ایک نظر دروازے کی طرف دیکھا۔ چچا کا شبہ یقین کو پہنچ گیا"۔ اب اس طرف دیکھنا۔ میں پہلے ہی جانتا تھا۔ چپکے چپکے میری پریشانی کا

تماشا دیکھ رہی ہیں۔ اس بچپن کی بھلا کوئی حد بھی۔ کیا بے معنی عورت ہے۔ اچھی بات ہے۔ میں نے بھی بیگم صاحبہ کا پاندان ہی غائب نہ کیا ہو تو کہنا"۔

بے تابی کے عالم میں کبھی صحن سے گزر کر باہر جاتے کبھی اندر آ جاتے۔ کنکھیوں سے چچی کو تاڑتے جا رہے تھے۔ کبھی باہر کھڑے ہو کر ڈاڑھی کھجانے لگتے۔ کبھی اندر آ کر پیٹ سہلانا شروع کر دیتے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کیا کریں"۔ کیا بیہودہ مذاق ہے! اور اگر میں ان کی اڑد جھنی کو دیا سلائی دکھا دوں۔ جب ؟ اندر کھڑے چور نظروں سے بار بار باورچی خانے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کہ اتفاق سے بنّو ہنڈ کلھیا کا سامان لئے اُدھر سے گزری چچا نے اسے اشارے سے بلایا۔ آہستہ سے کہا "بنّو! ایک کام کیجو۔ ہماری عینک کھوئی گئی ہے۔ باورچی خانے میں کہیں رکھی تھی۔ ڈھونڈ کر لا دے گی"؟

بنّو نے پوچھا "کون سی عینک"؟

چچا بولے "احمق کہیں کی۔ جو عینک ہم لگاتے ہیں۔

اَور کون سہی۔ مگر دیکھ تیری اماں کو نہ معلوم ہونے پائے"۔
بنّو چچا کا منہ تکتے ہوئے بولی" اپنی عینک لگا تو رکھی ہے آپ نے"۔

چچا نے چونک کر ہاتھ آنکھوں کی طرف بڑھایا" ہیں"۔ یقین نہ آیا۔ کہ جس شے کو ہاتھ نے چھوا۔ وہ عینک ہی ہے۔ اتار لی۔ ہاتھ میں لے کر گھما گھما کر دیکھنے لگے۔ پھر حیرت کے عالم میں ایک نظر بنّو پر ڈالی" یہ یہیں تھی! کب لگائی تھی ہم نے؟"

بنّو کو چھوٹی ہنسی۔ قہقہہ لگاتی اور اماں اماں کرتی ہوئی یہ بات سنانے باورچی خانے کو چلی۔ چچا نے لپک کر پکڑ لیا" ہیں ہیں! کیا ہوا؟ کہاں چلی؟ گلاب جامن کھائے گی؟ وہ بات تو ہم نے مذاق میں کی تھی۔ پاگل کہیں کی۔ اس میں اماں کو سنانے کی کیا بات؟ دیوانی ہوئی ہے۔ کیا لائیں تیرے لئے بازار سے؟ تھپڑ ماروں گا میں"۔

بنّو نے قہقہہ اور اماں اماں کی رٹ بند نہ کی۔ تو چچا نے غصّے میں اسے دھکّا دیا۔ وہ غریب گر کر رونے لگی۔

چچا جلدی سے باہر نکل گئے۔

شام کو چچا گھر آئے۔ تو لدے پھندے تھے۔ ایک ہاتھ میں مٹھائی کی ٹوکری۔ دوسرے میں کچوریوں کی۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی بچّوں کو پکارنا شروع کر دیا۔ ایسے خوش گویا صبح کچھ ہُوا ہی نہ تھا۔ سب کو لے کر پلنگ پر بیٹھ گئے مٹھائی اور کچوریوں میں سے وڈّو اور ببّو کو اوروں سے زیادہ حصّہ ملا۔ چچی کا حصہ ان کے لئے باورچی خانے میں بھیج دیا گیا۔

فراغت پانے کے بعد بندو کو لے کر ڈیوڑھی میں چلے گئے۔ اس سے کہا۔ "بندو یار۔ یہ تو لو تم ایک آنہ۔ اور اگر ایک کام کرو تو چونّی انعام۔ خاں صاحب نکڑ کی دکان پر حجّام کے ہاں خط بنوانے آیا کرتے ہیں۔ بائیسکل اپنا باہر رکھ جاتے ہیں۔ اب کے آئیں۔ تو چپکے سے جا کر ان کے بائیسکل میں پنکچر کر دیجیو"۔

# چچا چھکّن نے سب کے لئے کیلے خریدے

ایک بات میں شروع ہی میں عرض کر دوں۔ اس واقعے کے بیان کرنے سے حاشا وکلّا میری غرض یہ نہیں۔ کہ اس سے چچا چھکن کی فطرت کے جس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے متعلق آپ کوئی مستقل رائے قائم کر لیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ چچا چھکن کا اس نوع کا واقعہ مجھے صرف یہی ایک معلوم ہے۔ نہ اس سے پہلے کوئی ایسا واقعہ میری نظر سے گزرا۔ اور نہ بعد میں۔ بلکہ ایمان کی پوچھئے۔ تو اس کے برعکس واقعات بڑی کثرت سے میرے دیکھنے میں آ چکے ہیں۔ بارہا میں خود

دیکھ چکا ہوں۔ کہ شام کے وقت چچا چھکن بازار سے کچوریاں یا گنڈیریاں یا چلغوزے اور مونگ پھلیاں ایک بڑے سے رومال میں باندھ کر گھر بھر کے لئے لے آئے ہیں۔ اور پھر کیا بڑا اور کیا چھوٹا۔ ہر ایک میں برابر برابر تقسیم کر کے کھاتے کھلاتے رہے ہیں۔ پر اس روز اللہ جانے کیا بات ہوئی۔ کہ . . . مگر اسی کی تفصیل تو مجھے بیان کرنی ہے ؛

اس روز سہ پہر کے وقت اتفاق سے چچا چھکن اور بندو کے سوا کوئی بھی گھر پر موجود نہ تھا۔ میر منشی صاحب کی بیوی کو پرسوت کا بخار آ رہا تھا۔ چچی دوپہر کے کھانے سے فراغت پا کر ان کے ہاں عیادت کے لئے چلی گئی تھیں۔ بنو کو گھر چھوڑے جا رہی تھیں۔ کہ چچا نے فرمایا: "عیادت کو جا رہی ہو۔ تو شام سے پہلے بھلا کیا لوٹنا ہو گا بچی پیچھے گھبرائے گی۔ ساتھ لے جاتیں۔ وہاں بچوں میں کھیل کر بہلی رہے گی۔" چچی بڑبڑاتی ہوئی بنو کو ساتھ لے گئیں۔ امامی چچی کو میر منشی صاحب کے گھر تک پہنچانے

جا رہا تھا۔ مگر بنو ساتھ کر دی گئی۔ تو بچی کے خیال سے
اسے بھی وہیں ٹھہرانا پڑا۔

للّو کے مدرسہ کا ڈی۔ اے وی سکول سے
کرکٹ کا میچ تھا۔ وہ صبح سے اُدھر گیا ہوا تھا۔ مودے
کی رائے میں للّو اپنی ٹیم کا بہترین کھلاڑی ہے۔ اپنی
اس رائے کی بدولت اسے کرکٹ کے اکثر میچوں کا
تماشائی بننے کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ حسب معمول آج
بھی وہ للّو کی اردلی میں تھا۔

دو بجے سے سنیما کی میٹنی شو تھی۔ وِدّو چچا سے
اجازت لے کر تماشا دیکھنے جا رہا تھا۔ چھٹن کو جو پتہ لگا۔
کہ وِدّو تماشے میں جا رہا ہے۔ تو عین وقت پر وہ مچل
گیا۔ اور ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا۔ چچا نے اس کی
تربیت کے پہلوؤں پر چچی کا حوالہ دے دے کر ایک
مختصر مگر پُر مغز تبصرہ کرتے ہوئے اسے بھی اجازت دے
دی۔ واقعہ اصل یہ ہے۔ کہ چچی کہیں ملاقات کو گئی ہوں
تو باقی لوگوں کو باہر جانے کے لئے چچا سے اجازت لے

لینا دشوار نہیں ہوتا۔ ایسے نادر موقعوں میں چچا مکمل تنہائی کو زیادہ پسند کرتے ہیں، دوسری مصروفیات نے جن امور کی طرف چچی کو عرصہ سے توجہ کرنے کی اجازت نہیں دی ہوتی۔ ایسے وقت چچا ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اس سے چچی کو یہ احساس دلانا مقصود ہوتا ہے۔ کہ گھر کی مشین میں ان کی ہستی ایک بے کار پرزے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اور یہ چچا ہی کی ذات والاصفات کا ظہور ہے۔ کہ چشم بینا کو گھر میں سلیقے اور سگھڑاپے کے کوئی آثار نظر آتے ہیں۔

آج آپ کے شغل آفریں دماغ نے چچی کی غیر حاضری میں گھر کے تمام ایسے برتن جو پیتل کے تھے۔ صحن میں جمع کر لئے تھے۔ بندو کو بازار بھیج کر دو پیسے کی املی منگائی تھی۔ صحن میں مونڈھا ڈال کر بیٹھ گئے تھے۔ پاؤں مونڈھے کے اوپر رکھے ہوئے تھے حقے کی نے منہ سے لگی تھی۔ ذاتی نگرانی میں پیتل کے برتنوں کی صفائی کا اہتمام ہو رہا تھا۔

"ارے احمق - اب دوسرا برتن کیا ہوگا - جو برتن صاف کرنے ہیں - ان ہی میں سے کسی ایک میں املی بھگو ڈال - اور کیا . . . یوں . . . بس یہی پیتل کا لوٹا کام دے جائے گا - صاف تو اسے کرنا ہی ہے - ایک دوسرا برتن لا کر اسے خراب کرنے سے حاصل؟ ایسی باتیں تم لوگوں کو خود کیوں نہیں سوجھ جایا کرتیں؟"

بندو نے تعمیل ارشاد میں کچھ کہے بغیر املی لوٹے میں ڈال بھگو دی - چچا نے فخر سے اطمینان کا اظہار کیا "کیسی بنائی ترکیب؟ ضرورت بھی پوری ہو گئی - اور اپنا . . . یعنی کام بھی ایک حد تک ہو گیا - لے اب باورچی خانے جا کر برتن مانجھنے کو تھوڑی سی راکھ لے آ - کس برتن میں لائے گا بھلا؟"

بندو نے بڑی ذہانت سے تمام برتنوں پر نظر ڈالی - اور ان میں سے ایک سینی اٹھا کر چچا کی طرف دیکھنے لگا - چچا بھی اس غرض کے لئے شاید سینی ہی تجویز کرنا چاہتے تھے - ہدایت دینے کا افتخار نہ مل سکا - تو

پوچھنے لگے "کیوں بھلا؟"

بندو بولا "چولھے سے اٹھا کر اس میں آسانی سے راکھ رکھ لوں گا"۔

"احمق کہیں کا۔ علاوہ ازیں راکھ کھلے برتن میں ہو گی۔ تو اٹھا اٹھا کر برتن مانجھنے میں آسانی نہ ہوگی؟"

بندو ابھی باورچی خانے سے راکھ لانے نہ پایا تھا۔ کہ دروازے پر ایک پھل والے نے صدا لگائی۔ کلکتیا کیلے بیچنے لایا تھا اس کی صدا سنکر کچھ دیر تو چچا خاموش بیٹھے حقہ پیتے رہے۔ کش البتہ جلدی جلدی لگا رہے تھے معلوم ہوتا تھا۔ دماغ میں کسی قسم کی کشمکش جاری ہے۔ جب آواز سے معلوم ہوا۔ کہ پھل والا واپس جا رہا ہے۔ تو جیسے بے بس سے ہو گئے۔ بندو کو آواز دی۔ "ذرا جا کر دیکھیو تو کیلے کس حساب دیتا ہے"۔

بندو نے واپس آکر بتایا "چھ آنے درجن"۔

"چھ آنے کے درجن۔ تو کیا مطلب ہوا؟ کہ چوبیس پیسے کے بارہ۔ بارہ دونی چوبیس۔ یعنی دو دو پیسے کا ایک

اداس ہوں۔ مہنگے ہیں۔ جا کر کہہ۔ تین تین پیسے کے دو دیتا ہے تو دے جائے"۔

دو منٹ بعد بندو نے آکر کہا کہ" مان گیا۔ کتنے کیلے لینے ہیں؟"

پھل والا اس آسانی سے رضامند ہو گیا۔ تو چچا کی نیت میں فتور آیا۔

"یعنی تین تین پیسے کے دو؟ کیا خیال ہے۔ مہنگے نہیں اس بھاؤ پر؟"

بندو بولا۔" اب تو اس سے بھاؤ کا فیصلہ ہو گیا"۔

" تو کسی عدالت کا فیصلہ ہے۔ کہ اتنے ہی بھاؤ کیلے لئے جائیں۔ ہم تو تین آنے درجن لیں گے۔ دیتا ہے دے۔ نہیں دیتا نہ دے۔ وہ اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش"۔

بندو پس و پیش کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔" ابے تو جا کہہ تو سہی مان جائے گا"۔

بندو جانے سے کترا رہا تھا۔" آپ خود کہہ دیجئے"۔

چچا نے جواب میں آنکھیں پھاڑ کر بندو کو گھورا۔ وہ غریب ڈر گیا۔ مگر اب بھی وہیں کھڑا رہا۔ چچا کو اس کا پس و پیش شاید کسی قدر جائز معلوم ہؤا۔ اسے دلیل کا راستہ سمجھانے لگے "تو جا کر یوں کہہ۔ میاں نے تو تین آنے درجن ہی کہے تھے۔ مَیں نے آکر غلط بھاؤ کہہ دیا۔ تین آنے درجن دینے ہوں تو دے جائے"۔

بندو دل کڑا کر کے باہر چلا گیا۔ چچا جانتے تھے۔ بھاؤ ٹھہرا کر اس سے پھر جانے پر کیلے والا غل مچائے گا۔ باہر نکلنا قرین مصلحت نہ معلوم ہوتا تھا۔ دبے پاؤں اندر گئے۔ اور کمرے کی جو کھڑکی ڈیوڑھی میں کھلتی تھی۔ اس کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانکنے لگے۔ پھل والا گرم ہو رہا تھا۔ "آپ ہی تو ایک بھاؤ ٹھہرایا۔ اور اب آپ ہی زبان سے پھر گئے۔ بہانہ تو کہہ کی بھول کا۔ جیسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ یا بے ایمانی تیرا ہی آسرا"۔

بندو غریب چپکا کھڑا تھا۔ پھل والا بکتا جھکتا خوانچہ اٹھا چلنے لگا۔ بندو بھی اندر جانے کو مڑ گیا۔ دروازے

تک پہنچنے نہ پایا تھا۔ کہ پھل والا رک گیا۔ خوانچہ اتار کر بولا "کتنے لینے ہیں؟"

بندوا اندر آیا۔ تو چچا مونڈھے پر بیٹھے جیسے کسی خیال کی محویت میں حقہ پی رہے تھے۔ چونک کر بولے "مان گیا؟ ہم نہ کہتے تھے۔ مان جائے گا۔ ہم تو ان لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ تو کے کیلے لینے مناسب ہوں گے؟ چچا نے انگلیوں کی پوروں پر گن گن کر حساب لگایا" ہم آپ۔ چھٹن کی اماں۔ للو۔ وَدّو۔ بنو اور چھٹن کو بالچھ چھ دونی کیا ہوا؟ خدا تیرا بھلا کرے بارہ۔ یعنی ایک درجن۔ فی آدمی دو کیلے بہت ہوں گے؟ پھل سے پیٹ تو بھرا نہیں جاتا۔ منہ کا ذائقہ بدلا جاتا ہے۔ پر دیکھیو۔ دو تین گچھے اندر لے کر آنا۔ ہم آپ ان میں سے اچھے اچھے کیلے چھانٹ لیں گے"۔

پھل والے نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کیلوں کے گچھے اندر بھیج دئے۔ چچا نے کیلا ان کو دبا دبا کر دیکھا۔ ان کی چتیوں کا مطالعہ کیا۔ اور درجن بھر

کیلے علیحدہ کر لئے۔ کیلے والا باقی کیلے لے کر بڑبڑاتا ہوا رخصت ہو گیا۔ چچا نے بندو کی طرف توجہ کی۔" لے انہیں کھانے کی ڈولی میں حفاظت سے رکھ دے۔ رات کے کھانے پر لا کر رکھنا۔ اور جلدی سے آکر برتن مانجھنے کے لئے راکھ لا۔ بڑا وقت اس قصے میں ضائع ہو گیا"۔

بندو کیلے اندر رکھ آیا۔ اور باورچی خانے سے راکھ لا کر برتن مانجھنے لگا۔" یوں . . . ذرا زور سے ہاتھ تا کہ برتن پر رگڑ پڑے۔ اس طرح! پیتل کے برتن صاف کرنے کے لئے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے۔ کہ املی کے استعمال سے قبل انہیں ایک بار خوب اچھی طرح مانجھ کر صاف کر لیا جائے۔ ایسے سب برتنوں کی صفائی کے لئے املی نہایت لاجواب نسخہ ہے۔ گرہ میں باندھ رکھ۔ کسی روز کام آئے گا۔ اور ایک پیتل ہی کا کیا ذکر۔ دھات کی جملہ اشیاء املی سے دمک اٹھتی ہیں۔ ابھی ابھی تو آپ دیکھیو۔ کہ ان کالے کالے برتنوں کی صورت کیا نکل آتی ہے"۔ ہاں اور وہ میں نے کہا۔ کیلے احتیاط سے

رکھ دئے ہیں نا؟ ڈولی میں؟ ہوں۔ اچھے بھاؤل گئے ایک ایک کے لئے دو دو ٹھیک رہیں گے؟ . . .

یوں۔ بس منجھ گیا۔ اب رگڑ اس پر املی۔ اِس طرح۔ دیکھا میل کس طرح کٹتا ہے۔ کیسی چمک آتی جا رہی ہے؟ یہ املی فی الواقع بڑی بے نظیر شے ہے۔ مگر میں نے کہا۔ بندو میرا بھائی۔ ذرا اٹھ تو۔ ان کیلوں میں سے دو جو ہمارے حصے کے ہیں۔ ہمیں لا دیجئے۔ ہم ابھی کھا لیتے ہیں۔ باقی لوگ جب آئیں گے۔ اپنا حصّہ کھاتے رہیں گے"۔

بندو نے اٹھ کر دو کیلے چچا کو لا دئے۔ چچا نے مونڈھے پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے پینترا بدلا۔ اور کیلوں کو تھوڑا تھوڑا چھیلنا اور تکلف سے نوش فرمانا شروع کیا۔ "تو کئے جا اپنا کام۔ ذرا جھپاک سے۔ ہاں۔ دیکھنا اب ذرا دیر میں ان برتنوں کی شکل کیا نکل آتی ہے . . .

اچھے ہیں کیلے . . . بس یوں ہی۔ ذرا زور سے ہاتھ . . . اس طرح . . . چھٹن کی اماں دیکھیں گی

تو سمجھیں گی۔ آج ہی نئے برتن خرید کئے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ خرچ کچھ بھی نہیں۔ ہرا لگے نہ پھٹکری اور رنگت چوکھی آئے۔ آخر کتنے کی آگئی املی؟ نہ نہ خود ہی کہو کتنے کی آئی املی؟ دو پیسے کی نا؟ تو آپ خرید کر لایا تھا اور پھر جو کچھ کیا۔ تو نے اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔ یہ تو ہوا نہیں۔ کہ تجھ سے آنکھ بچا کر ہم نے بیچ میں کچھ ملا دیا ہو بس یہ جتنی بھی کرامات ہے۔ صرف املی کی ہے۔ محض املی کی۔ اور وہ میں نے کہا۔ اب کے کیلے باقی رہ گئے ہیں؟ دس؟ ہوں۔ خوب شے ہے نا املی؟ ایک ٹکے کے خرچ میں چیزوں کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ مگر بندو۔ ان دس کیلوں کا حساب اب بیٹھے گا کس طرح؟ یعنی ہم شریک نہ ہوں۔ جب تو ہر ایک کو دو دو کیلے مل رہیں۔ لیکن ہماری شرکت کے بغیر شاید دوسروں کا جی بھی کھانے کو نہ چاہے۔ کیوں؟ چھٹن کی اماں تو ہمارے بغیر نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھنا چاہیں گی۔ تو نے خود دیکھا ہوگا۔ کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ اور بچوں

میں بھی دوسرے ہزار عیب ہوں۔ پر اتنی خوبی ضرور ہے۔ کہ ندیدے اور خود غرض نہیں ہیں۔ سب نے مل کر شریک ہونے کے لئے ہم سے اصرار شروع کر دیا تو بڑی دِقّت ہوگی۔ برابر برابر تقسیم کرتے تو کیلے کاٹنے پڑیں گے۔ اور کلکتیا کیلے کی بساط بھلا کیا ہوتی ہے۔ کاٹنے میں سب کی مٹی پلید ہوگی۔ کَے کیلے بتائے تھے تو نے؟ دس؟ دس کیلے اور چھ آدمی۔ ٹیڑھی بات ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں مثلاً فی آدمی ایک ایک کا حساب رکھ دیا جائے تو؟ دو دو نہ سہی۔ ایک ہی ہو۔ مگر کھائیں تو سب ہنسی خوشی مل جل کر۔ ٹھیک ہے نا؟ گویا چھ رکھ چھوڑنے ضروری ہیں۔ تو اس صورت میں کَے کیلے ضرورت سے زیادہ ہوئے؟ چار نا؟ ہوں۔ تو میرے خیال میں وہ چاروں زائد کیلے لے آتا۔ باقی کے چھ تو اپنا ٹھیک حساب کے مطابق تقسیم ہو جائیں گے"۔

بندو اٹھ کر چار کیلے لے آیا۔ چچا نے اطمینان سے انہیں باری باری نوش فرمانا شروع کر دیا۔

"ہاں۔ تو تُو قائل بھی ہُوا املی کی کرامات کا؟ بے شمار فوائد کی شے ہے۔ مگر کیا کیجے۔ اس زمانہ میں دیس کی چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ یہی املی اگر ولایت سے ڈبوں میں بند ہو کر آتی۔ تو جناب لوگ اس پر ٹوٹ کر پڑتے۔ ہر گھر میں اس کا ایک ڈبّا موجود رہتا مگر چونکہ پنساری کی دکان سے دستیاب ہو جاتی ہے کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ اور پھر ایک برتنوں کی صفائی کا کیا ذکر۔ اس کے اور بھی تو بہتیرے فوائد ہیں۔ یعنی دوران سر کی شکایت کے لئے اس سے بہتر شے سننے میں نہیں آئی۔ اور پھر یہ بھی نہیں۔ کہ کڑوی کسیلی ہو یا بدمزہ بو دار ہو۔ شربت بنائیے۔ کھٹا میٹھا ایسا لذیذ ہوتا ہے کہ کیا کہئے . . . کیلے بھی نہایت ہی لذیذ ہیں۔ زیادہ نہ لے لئے تو نے . . . املی کا شربت تو شاید تو نے بھی پیا ہو۔ کیا خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ گرمیوں میں تو نعمت ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ مفید بھی بے حد۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ امتلا کو یہ روکتا ہے۔ امتلا نہیں جانتا؟

ارے احمق منلی کی شکایت۔ اس کے علاوہ صفرا کے لئے یہ مفید ہے۔ صفرا بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ پھر کبھی سمجھائیں گے۔ تو وہ کیلے تو اب چھ ہی باقی رہ گئے ہیں نا؟ کچھ نہیں۔ بس ٹھیک ہے۔ سب کے حصّے میں ایک ایک آجائے گا۔ ہمیں ہمارے حصے کا مل جائے گا۔ دوسروں کو اپنے اپنے حصّے کا۔ کاٹ چھانٹ کا جھگڑا تو ختم ہوا۔ اپنے اپنے حصے کا کیلا لیں۔ اور جو جی چاہے کریں۔ جی چاہے آج کھائیں۔ آج جی نہ چاہے کل کھالیں۔ اور کیا۔ ہونا بھی یوں ہی چاہیئے۔ رغبت کے بغیر کوئی چیز کھائی جائے تو جز و بدن نہیں بننے پاتی یعنی اکارت چلی جاتی ہے۔ کوئی چیز آدمی کھائے اسی وقت جب اس کے کھانے کو جی چاہے۔ چھٹن کی اماں کی ہمیشہ سے یہی کیفیت ہے۔ جی چاہے تو چیز کھاتی ہیں۔ نہ چاہے تو کبھی ہاتھ نہیں لگاتیں۔ ہمارا اپنا بھی یہی حال ہے۔ یہ متفرق چیزیں کھانے کو کبھی کبھا ہی جی چاہتا ہے۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے۔ اب

ہی کیلے ہیں۔ بیسیوں مرتبہ دکانوں پر رکھے دیکھے۔ کبھی رغبت نہ ہوئی۔ آج جی چاہا۔ تو کھانے بیٹھ گئے۔ اب پھر نہ جانے کب جی چاہے۔ ہماری تو کچھ ایسی ہی طبیعت ہے۔ نہ جانے شام کو جب تک سب آئیں رغبت رہے یا نہ رہے۔ یقین سے کیا کہا جا سکتا ہے، دل ہی تو ہے۔ ممکن ہے اس وقت کیلے کے نام سے طبیعت نفور ہو، تو ایسی صورت میں ہم جانیں۔ ہم تو بقیہ چھ کیلوں میں سے اپنے حصے کا ایک کیلا ابھی کھا لیتے۔ کیوں؟ اور کیا۔ اپنی اپنی طبیعت ہے۔ اپنی اپنی بھوک جب جس کا جی چاہے کھائے۔ اس میں تکلف کیا۔ ایسے معاملوں میں تو بے تکلفی ہی اچھی ؎

"اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
"آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے۔

"تو ذرا اٹھیو میرا بھائی۔ بس میرے ہی حصے کا کیلا لانا۔ باقی کے سب وہیں احتیاط سے رکھے رہیں"۔

حسب الارشاد بندو نے کیلا چچا کو دلا دیا۔ چچا چھیل

کورنش فرمانے لگے۔

" دیکھا کیا صورت نکل آئی برتنوں کی؟ سبحان اللہ۔ یہ املی کا نسخہ موثر ہی ایسا ہے۔ اب انہیں دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ پرانے برتن ہیں؟ جو دیکھے گا۔ یہی سمجھے گا۔ ابھی ابھی بازار سے منگوا کر رکھے ہیں۔ دوسروں کا کیا ذکر۔ ہماری غیر حاضری میں یوں صاف کئے گئے ہوتے۔ تو واپس آکر ہم خود نہ پہچان سکتے۔ چھٹن کی اماں بھی دیکھیں گی۔ تو ایک بار تو ضرور چونک پڑیں گی۔ تجھ سے پوچھیں۔ تو کہہ دیجو میاں ساری دوپہر بیٹھ کر صاف کراتے رہے ہیں۔ پر ایک بات۔ املی کا ذکر نہ آنے پائے۔ ہاں۔ ایسی بات بنا دو۔ تو کام کی وقعت کھو جاتی ہے سمجھ گیا نا؟ بس۔ اب یہ املی کی بات آگے نہ نکلنے پائے۔ جو پوچھے۔ یہی کہیو۔ میاں نے ایک نسخہ بنا کر اس سے صاف کرائے ہیں۔ بچوں سے بھی ذکر نہ کیجو۔ ورنہ نکل جائے گی بات۔ کب تک آئیں گے بچے؟ للو کا میچ تو شاید شام سے پہلے ختم نہ ہو۔ اس کے کھانے چائے کا

انتظام ٹیم والوں ہی نے کر دیا ہوگا۔ ورنہ خالی پیٹ کرکٹ کس سے کھیلا جاتا ہے۔ کوئی انتظام نہ ہوتا تو مودے کو بھیج کر وہیں کھانا منگوا سکتا تھا۔ خوب تر نقمے اڑا رہے ہوں گے آج۔ میوے مٹھائی سے ٹھسا ٹھس پیٹ بھر لیا ہوگا۔ چلو کیا مضائقہ ہے۔ یہی عمر کھانے پینے کی ہے۔ اور پھر گھر کے دوسرے لوگ نعمتیں کھائیں۔ تو وہ غریب کیوں پیچھے رہے؟ ودّو اور چھٹن تو ٹکٹ کے دام کے ساتھ کھانے پینے کے لئے بھی پیسے لے کر گئے ہیں۔ اور کیا؟ وہیں کسی دکان پر میوہ مٹھائی اُڑا رہے ہوں گے۔ خدا خیر کرے۔ ثقیل چیزیں کھا کھا کر کہیں بدہضمی نہ کر لائیں۔ ساتھ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہے۔ تردّد ہوتا ہے۔ بنّو کا تو یہ ہے کہ ماں ساتھ ہے۔ وہ خیال رکھے گی۔ کہ کہیں زیادہ نہ کھا جائے۔ مگر میں کہتا ہوں۔ کیلے ہم نے آج بڑے بے موقع لئے۔ اُس وقت خیال ہی نہ آیا۔ کہ آج تو یہ سب بڑی بڑی نعمتیں اڑا رہے ہوں گے۔ کیلے

کو کیوں خاطر میں لانے لگے۔ اور تو نے بھی یاد نہ دلایا۔ ورنہ کیوں لیتے اتنے بہت سے کیلے؟ بے کار ضائع جائیں گے۔ ان پر رات گزر گئی۔ تو خاک بھی باقی نہ رہے گا۔ سوکھ کر سیاہ پڑ جائیں گے۔ مگر خود کردہ را علاجے نیست۔ اب خرید جو لئے۔ کیا کیا جائے۔ کسی نہ کسی طرح تو ٹھکانے لگانا ہی پڑے گا۔ پھینکے تو جا نہیں سکتے۔ پھر لے آنا یہیں۔ مجبوری کو میں ہی انہیں ختم کر ڈالوں۔"

# انارکلی

## بیسویں صدی کی ایک زندہ جاوید تصنیف

جس نے ہندوستان ہی میں نہیں

**بلکہ**

بین الاقوامی ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا

کیا آپ جانتے ہیں کہ

یہ ٹریجیڈی جاپان میں سٹیج ہوئی

اور

انگلستان کے ایک موقر سٹیج پر بھی اس کی نمائش ہونے والی ہے

مشرق و مغرب کے بعض نامور مایۂ ناز مصوروں کے شاہکار بھی

اس میں آپ کو نظر آئیں گے

انارکلی ہندوستان کے مایۂ ناز ڈراما نگار سید امتیاز علی صاحب تاج

کا ایک معرکہ آرا حزنیہ ڈراما ہے۔ جس کی ادبی عظمت دیکھ کر حکومت پنجاب

نے مصنف کو ادبیات کا بیش بہا انعام دیا۔

اخبارات اور رسائل نے اس پر اتنے مضامین لکھے، اور ایسے ریویو

شائع کئے۔ جیسے اور کسی کتاب کے متعلق شائع نہیں ہوئے۔

ہندوستان کے مقتدر نقادوں مشہور اداکاروں اور نامور ڈائرکٹروں نے اس کتاب کے مصنف کو ڈراما کے عہد نو کا بانی قرار دیا۔

اس غم انجام ڈرامے کا ہر فقرہ ایک غمناک شعر۔ ایک طویل افسانہ ہے۔

جس کسی نے انارکلی کو پڑھا۔ اس نے اپنے دل میں غم کے نشتر چبھوئے۔ جس نے انارکلی کو نہیں پڑھا۔ اسے معلوم نہیں کہ اردو ادب اس کتاب کے چھپنے سے کس بلندی پر جا پہنچا ہے۔ اس زبردست ٹریجیڈی کے مطالعہ سے محروم نہ رہیے گا۔

## ملاحظہ فرمایئے

اس کتاب کے متعلق دنیا نے کیا کہا:۔

**علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ**۔ انارکلی کی زبان میں روانی اور انداز بیان میں دلفریبی ہے۔

**ڈاکٹر محمد دین تاثیر ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی**۔ انارکلی سٹیج اور مطالعہ ہر دو اعتبار سے کامیاب ہے۔ اس کی اشاعت سے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

**منشی پریم چند**۔ مجھے جتنی کشش انارکلی میں محسوس ہوئی۔ د

اور کسی ڈرامے میں نہیں ہوئی ؏

**سید احمد شاہ صاحب بخاری ایم اے کینٹب (پطرس) کنٹرولر آل انڈیا ریڈیو۔** انارکلی اردو ڈراما کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی ؏

**سید سجاد حیدر یلدرم۔** ایک کتاب جس سے آنکھوں میں نور اور دل میں ہمدردی عاشق مہجور پیدا ہوتی ہے ؏

**مرزا محمد سعید صاحب دہلوی۔** انارکلی کی اشاعت ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے ؏

**عنایت اللہ خاں مہتمم محکمۂ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی**

یہ ان کتابوں میں سے ہے اور ایسی کتابیں شاذ و نادر رہی ہیں۔ جن کو دیکھ کر پڑھ کر اور اپنے پاس رکھ کر ہمیشہ دل خوش ہوتا ہے۔ اور ان کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؏

---

قیمت صرف

ملنے کا پتہ:۔

**دار الاشاعت پنجاب لاہور**

# ہیبت ناک افسانے

## طنز — ہیبت — دہشت — تاثیر اور گداز

ان افسانوں کی

نمایاں خصوصیات ہیں

موریس لیول عہد حاضر کا ایک معجز نگار فرانسیسی فسانہ نگار ہے
یہ شاہکار اسی کی قوت فکر کی دہشت ناک تصویریں ہیں ؀

موریس لیول کی کہانیوں کے متعلق نقادوں کی رائے ہے
کہ ان میں ایک لفظ تک زائد از ضرورت استعمال نہیں کیا گیا۔ اور
اس کے افسانوں کی عظمت کی ایک دلیل یہ بھی ہے ؀

یہ افسانے اردو کے افسانہ نگاروں کے لئے مشعل ہدائت
کا کام دے سکتے ہیں ؀

اس کا ترجمہ
سید امتیاز علی صاحب تاج نے کیا ہے
ایسا ترجمہ کہ اصل نقل کا منہ تکتی رہ گئی ہے

اس کتاب کو ضرور منگوایئے

قیمت

ملنے کا پتہ

## دارالاشاعت پنجاب لاہور

سید حمید علی نے امرت الیکٹرک پریس ریلوے روڈ لاہور میں باہتمام دھرم چند بھارگو بی ایس سی چھپوائی